دینی امور پر اجرت کا حکم

اور

غلط فہمیوں کا ازالہ

مرتب

مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی نقشبندی مجددی

ناظم دار العلوم رشیدیہ حیدرآباد

ناشر

دار العلوم رشیدیہ

مہدی پٹنم، حیدرآباد

دینی امور پر اجرت کا حکم

اور

غلط فہمیوں کا ازالہ

مرتب

مفتی احمد اللہ نثار صاحب نقشبندی مجددی
ناظم دار العلوم رشیدیہ حیدرآباد

دار العلوم رشیدیہ
زیر انتظام: رشیدیہ ایجوکیشنل چیریٹیبل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ

تفصیلات

نام کتاب : دینی کاموں پر اجرت کا حکم اور غلط فہمیوں کا ازلہ
مرتب : مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی نقشبندی مجدّدی
اشاعت : 2025ء
تعدادِ صفحات: ۲۲۷
ناشر : دار العلوم رشیدیہ حیدر آباد

ملنے کے پتے

(۱) دار العلوم رشیدیہ مہدی پٹنم حیدر آباد: 8341658711
7253927867
8179076739

(۲) مکتبہ فاروق
(۳) دیوبند، سہارنپور کے مشہور کتب خانے
(۴) تھانہ بھون خانقاہ
(۵) اویس کتاب گھر بھروچ
(۶) مکتبہ ریاض الجنۃ، پلوامہ کشمیر
(۷) مکتبہ ابرار کیرانہ، ضلع شاملی

اجمالی فہرست

فہرس

دینی امور پر اجرت کا جواز احادیث و آثار کی روشنی میں

علمائے احناف اور تمام مکاتب فکر کا موقف

ذمہ داران سے متعلق اہم امور و مسائل

اہلِ علم و مدارس سے متعلق چند اہم امور

توصیفی کلمات

مفتی مشہود الدین صاحب قاسمی مدظلہ

استاذ حدیث وفقہ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا میں انسان کا جو ذریعہ خدمت ہے، وہی بالعموم اس کا ذریعہ معاش بھی ہے، ڈاکٹر انجینیئر اور لائر وغیرہ واضح مثال ہیں، دین اسلام جو فطرت کے عین مطابق ہے اس میں بھی یہ اصول پوری طرح ملحوظ ہے کہ دینی امور جہاں خدّامِ دین کے لیے ذریعہ خدمت ہیں وہیں ان کا ذریعہ معاش بھی ہیں، مزید شرف کی بات یہ ہے کہ یہ امور عین طاعت وعبادت اور باعث اجر وثواب ہیں، دور اول میں اس سعادت مند طبقہ کی ضروریات کا باحسنِ وجوہ معیاری تکفّل بیت المال کے توسط سے وظائف کی شکل میں ہوتا تھا، پھر جب بیت المال کا نظام باقی نہ رہا اور دینی امور میں بدنظمی اور بے ضابطگی کا احساس ہونے لگا نتیجتاً دین کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا تو بقائے دین کی خاطر فقہائے متاخرین نے یہ ذمہ داری عامۃ المسلمین کے کاندھوں پر رکھی اور اس کی فقہی تکییف اجرت کے نام سے ہوئی۔

غرض دینی امور پر اُجرت کا جواز تب سے اب تک ایک متفق علیہ مسئلہ ہے، مگر وقتاً فوقتاً بعض لوگ اس سے اختلاف کرتے رہتے ہیں، اس پر اعتراضات کرتے ہیں اور عوام کو کنفیوز کرتے ہیں، حالیہ دنوں شہر حیدرآباد کی ایک معروف شخصیت کے ایسے

ہی ایک زوردار بیان سے پورے علاقے میں اضطرابی ماحول پیدا ہوگیا، اور سب کا شدت سے یہ احساس تھا کہ اس بیان کا سنجیدہ اور مدلل و مستحکم رد آنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ بے حد جزائے خیر عطا فرمائے برادر گرامی قدر مولانا مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی دامت برکاتہم کو کہ وہ زمانے کے بڑے نبض شناس واقع ہوئے ہیں، سلگتے اور حساس مسائل پر پوری بصیرت، جرات اور ہمت کے ساتھ زبان وقلم کو جنبش دے کر فرضِ کفایہ ادا کرتے رہتے ہیں اور جدید ذرائع ابلاغ کا بھی بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

زیر بحث مسئلہ میں بھی ممدوح گرامی مفتی صاحب کو اس سلسلے کی بے اعتدالیوں کا خوب ادراک اور سابقہ تھا اس لیے حسب معمول بہت پہلے ہی اس مسئلے پر قلم اٹھایا تھا اور ایک مفصل اور مدلل کتاب ترتیب دی تھی، جو اب ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیت علمائے ہند کے بیسویں فقہی اجتماع کے زریں موقع سے شائع ہونے جا رہی ہے، امید ہی نہیں، یقین ہے کہ موجودہ احوال میں اس کتاب کی اشاعت فرض کفایہ ہونے کے ساتھ اس قرض کی ادائیگی بھی ہے جو یہاں کے اہل علم پر دفعتہً آپڑا تھا۔

کتاب کیا ہے؟

متعلقہ موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہے، ابتداء میں مقدمۃ العلم کے نام سے ایک قیمتی اور طویل مقدمہ ہے پھر چھ باب ہیں:

۱۔ دینی امور پر اجرت کا جواز آحادیث وآثار کی روشنی میں
۲۔ علمائے احناف اور تمام مکاتب فکر کا موقف
۳۔ دینی خدمات کی تنخواہ لینے پر اعتراضات کی حقیقت
۴۔ دینی امور کی تنخواہ کے عدم جواز کے دلائل کی حقیقت
۵۔ ذمہ داران سے متعلق اہم امور ومسائل

۶۔اہل علم ومدارس سے متعلق چند اہم امور

ماشاءاللہ ہر مضمون مدلل، سہل اور عام فہم ہے، عام قاریوں کے لیے جہاں یہ نفع بخش ہے وہیں ناقدین ومعترضین کے لیے اس میں تشفی کا بہم سامان ہے اور کتاب کی مفتی صاحب کی طرف نسبت ہی کافی ہے اس کے معتبر اور مفید ہونے کے لیے کیونکہ اس میں شبہ نہیں کہ مفتی صاحب موفق ومنصور شخصیت ہے نظامت، افتاء وقضاء، تدریس تبلیغ اور تصوف وسلوک کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا غیر معمولی ملکہ اللہ تبارک وتعالی نے عطا فرمایا ہے، مطالعہ میں وسعت اور تالیف میں سرعت کا کمال ہے کہ اب تک 70 سے زائد قیمتی کتب، علمی، فقہی، فکری، و اصلاحی آپ کے اشہب قلم سے نکل کر آپ کے عظمت و وقار اور اعتبار و استناد کا وثیقہ بن چکی ہیں۔

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالی عافیت کے ساتھ حضرت مفتی صاحب کے فیض کو عام و تام فرمائے اور آپ کی جملہ کتب و مآثِر علمیہ کو مفید عام وخاص کر کے شرف قبولیت سے نوازے اور زادِ آخرت بنائے۔آمین یارب العالمین۔

(مولانا مفتی) مشہود الدین قاسمی (صاحب مدظلہ)

15 ربیع الاول 1447ھ

بروز پیر

فیضِ خاطر

آئے دن واٹس ایپ یا شوشل میڈیا کے ذریعہ نادان دوستوں کی طرف سے کوئی نہ کوئی غیر دانشمندانہ پوشٹ یا آڈیو دینی حلقوں میں گردش کرتے رہتا ہے جس میں ائمہ، مؤذنین اور معلمینِ دینی مدارس و مکاتب کی تنخواہ سے متعلق پوری شرافت کے ساتھ بدتمیزی ہوتی ہے، قرآنی آیات اور احادیث کو بے محل استعمال کر کے دینی امور پر تنخواہ لینے کو ''دینی خدمت نہیں بلکہ دین فروشی اور دنیاداری ہونا باور کرایا جاتا ہے'' ساتھ میں احمقانہ مشورے بھی دئے جاتے ہیں کہ علماء کو گیرج، گوشت، کپڑے، راشن، اور سبزی کی دوکان پر کام کر کے یا تجارت کر کے روزی کمانا چاہیے اور امامت، اذان دینے، اور دینی مدارس میں خدمت بغیر تنخواہ کے کرنا چاہیے، یہ بات ایسی زہریلی اور خطرناک ہے کہ اس سے دینی شعبوں کو کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے اُس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

دینی خدام کے گذر اوقات کا ذمہ دار الاسلام میں اسلامی حکومت پر ہوتا ہے؛ لیکن جب اسلامی ریاست نہیں رہی، بیت المال کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور زندگی کے ذمہ داریاں بڑھ گئیں تو انفرادی سطح پر خدام دین کی کفالت کی ترتیب قائم ہوئی؛ اگر یہ نظام نہ ہوتا تو خدمتِ دین کا عظیم سلسلہ ختم ہو کر دین کی نشر و اشاعت کا سلسلہ بند ہو جاتا، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مؤذن، امام، قاری اور علوم عربیہ کے معلمین کی تقرری فرماتے تو اُن کے بیش بہا وظیفے بھی مقرر فرماتے۔

عہد صحابہ و تابعین سے دینی خدّام کی خدمت کے جواز پر تمام اُمتِ محمدیہ ﷺ کا اجماع ہے، عرب و عجم کے تمام علماء تعلیم و تبلیغ بلکہ اذان و اقامتِ نماز پر تنخواہیں، کہیں سرکاری بیت المال سے، اور کہیں انجمن یا کمیٹی یا کسی تنظیم کی طرف سے دینے کے نظام کو درست قرار دیا ہے، کہیں ایک ہی باتوفیق شخص تنخواہ کی ذمہ داری پوری کرتا ہے، آج تک

کسی، عالم، محدث، فقیہ، نے تنخواہ کی حرمت کا فتویٰ دے کر دینی شعبوں کے انسداد کی کوشش نہیں کی، پتہ نہیں اب اس مسئلہ کے چھیڑنے والے علم وعقل عاری دوستوں کے پاس کونسی وحی نازل ہوگئی، جس کی بناء پر متفق علیہ مسئلہ میں انتشار پیدا کرنے کو دینی فریضہ سمجھ لیا ہے، جبکہ یہ حقیقت ہے کہ اِس مسئلہ پر گفتگو کرنے والوں کو اتنی علمی صلاحیت ہے کہ وہ تحقیقی مسائل میں فقہاء سابقین سے سبقت لے جاسکیں، نہ اتنی علمی گیرائی ہے کہ منشاء شریعت کو سمجھ سکیں اور نہ اتنا تقویٰ ہے کہ وہ مختلف فیہ مسائل میں قولِ محتاط پر عمل کر کے شبہات سے بچ سکیں، پتہ نہیں کس نیت سے اجتہاد کے میدان میں خود کی ناک کٹوانے اور ایک مخصوص حلقہ کو اہلِ علم سے بیزار کرنے، خواص وعوام میں نفرت پیدا کرنے اور تمام علماء کرام کی خدمات کو دینی خدمات سے خارج کر کے علماء دین کو ’’بے دین‘‘ یا ’’دین فروش‘‘ و ’’دنیادار‘‘ کے لقب سے نوازنا چاہتے ہیں، جبکہ یہ مسئلہ اجماعی اور اتفاقی بن چکا ہے اور جو اسکے خلاف رائے گھڑے وہ غیر معتبر وفتنہ پرور ہے۔

اس مسئلہ پر عاجز کی نظر میں دو شخصیتوں نے بہترین کام کیا ہے، ایک ڈاکٹر ابو جابر عبداللہ دامانوی صاحب جن کا رسالہ ۲۰۰۴ء میں ’’دینی امور پر اُجرت کا جواز‘‘ کے نام سے مکتبہ دارالرحمانیہ کراچی سے طبع ہوا، اور دوسری شخصیت ابویحیی نور پوری صاحب جن کا مختصر مگر جامع مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا، عاجز نے اپنے اس رسالہ میں ان دو حضرات کی تحریر سے خوب استفادہ کیا ہے، جزاھم اللہ احسن الجزاء، ان کے علاوہ بہت سے اہلِ علم ودانش کے مضامین اور اہلِ تحقیق کی تحقیقات واہل فتاوی کے فتاوے بھی اس موضوع پر کافی وشافی ہیں، عاجز نے اُن تمام تحریرات کو سامنے رکھ کر خلاصہ اور لبِ لباب موجودہ حالات کے اعتراضاتِ واھیہ وقیاساتِ فاحشہ کی تردید کے ساتھ جمع کرنے اور مرتب انداز میں ترتیب دینے کی کوشش کی ہے، جو کچھ بھی تعمیری کام ہوا وہ عاجز سے پیش رو احباب کے کام کی بنیاد پر ہوا۔

مسئلہ کا حکم دلائل کی روشنی میں جاننے کی طلب رکھنے والوں اور منکرین اُجرت سے خیرخواہانہ درخواست ہے کہ خالی الذہن ہو کر موضوع کا از اوّل تا آخر مطالعہ کریں، جذباتی نہ ہوں، افراط وتفریط کے شکار نہ ہوں، چیخنے اور چلّانے سے حق پر ہونا ثابت نہیں ہوتا،''اپنی جان اور اپنا مال''لگا کر دین کی خدمت کرنے سے تنخواہ کی حرمت ثابت نہیں ہوجاتی، چندہ کو''مصافحہ''اور''رومال''کے ذریعہ وصول کرنے سے حکم بدل نہیں جاتا، اللہ جزائے خیر دے مفتی مشہود الدین صاحب قاسمی مدظلہ کو کہ کم وقت میں عاجز کی حیثیت سے زیادہ کلمات سے نوازا، اللہ نے آپ کافی عملی صلاحیتوں سے نوازا ہے، کئی شاگرد آپ سے فیض یاب ہورہے ہیں، اللہ آپ کو بہترین بدلہ دے۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت رسالہ کو نفع عام کا ذریعہ بنائے۔

احمد اللہ نثار قاسمی نقشبندی مجدی

خادم دار العلوم رشیدیہ حیدرآباد

27/11/2024ء

مقدّمۃ العلم

عبادات و دینی کام سے مراد

دینی کاموں سے وہ خدمات مراد ہیں جو مسلمانوں ہی سے متعلق ہیں، بحیثیت مسلمان انجام دی جاتی ہیں اور دراصل اس کے نفع وضرر اور اس پر اجروثواب اور اس سے غفلت و بے اعتنائی پر عذاب وعقاب کا علاقہ بھی آخرت ہی سے ہے۔

لفظ طاعت و قربت کی وضاحت

مفتی عبیدالرحمان مردان صاحب لکھتے ہیں ''طاعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کا ایک وسیع مفہوم ہے، لغت میں: دلی رضامندی اور خوشی سے حکم کی پاسداری کو''، جبکہ شرعی اصطلاح میں احکام شریعت بجالانے کو طاعت کہا جاتا ہے، شریعت کے احکام سے مراد عام ہیں، چنانچہ واجبات، فرائض، سنن اور مستحبات سب کو شامل ہے، اسی طرح حرام یا مکروہ کاموں سے اپنے آپ کو بچانا بھی طاعت کے مفہوم میں داخل ہے۔

طاعت کا ہم معنی ایک لفظ ''قربت'' ہے یہ بھی طاعت کی طرح تمام شرعی احکامات کے بجالانے کو کہا جاتا ہے، لفظِ طاعت کے اس عام مفہوم کو دیکھتے ہوئے تمام طاعات پر اجرت لینے کو ناجائز سمجھنا درست نہیں، کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ طاعت کے عموم میں مستحبات بھی داخل ہیں، حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ مستحبات یا مندوبات پر اجرت لینا مطلقاً منع نہیں، مباحات کا مسئلہ بھی کچھ اسی طرح ہے؛ کیونکہ کوئی بھی مباح کام اگر نیک نیت سے کیا جائے وہ بھی نیکی اور باعث ثواب ہے اور طاعت کے مفہوم میں داخل ہے؛ لہٰذا اگر مطلقاً طاعات پر اجرت لینے کو حرام قرار دیا جائے تو اس سے بڑی حد تک مشکلات پیدا ہوں گی، اور جس سہولت اور آسانی کے پیشِ نظر شریعت مطہرہ نے عقدِ اجارہ کی اجازت

دی ہے وہ سہولت ختم ہو کر لوگ مشکل میں پڑ جائیں گے، حالانکہ یہ شریعت مطہرہ کے مزاج کے بالکل خلاف ہے، معلوم ہوا کہ طاعات پر اجرت کا ناجائز ہونا یہ حکم اتنا عام نہیں ہے کہ ہر ہر نیکی اور طاعت کو شامل ہو۔

جو طاعت اسلام کے ساتھ خاص ہو اس پر اجرت لینا

(ا) اسلام کے ساتھ خاص ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تصور اسلام نے پیش کیا ہو، اگر اسلام نہ ہوتا تو اسے کار ثواب کے طور پر نہ جانا جاتا، چنانچہ اگر کافر وہ کام ادا کرے تو اس کا شرعاً اعتبار نہ کیا جائے گا، امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"أصل المسألة أن الاستئجار على الطاعات التي لا يجوز أداؤها من الكافر لا يجوز عندنا"(۱)

ترجمہ: طاعات کے بارے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ جس طاعت کی ادائیگی کا کافر اہل نہ ہو اس پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے، (جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ)، اس قسم کاموں پر اجرت ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ: ان امور میں نیابت معتبر نہیں۔ (ایسا ممکن نہیں کہ ایک آدمی دوسرے کی طرف سے ادا کر کے اس کا ذمہ فارغ کرے) اور چونکہ اجرت دینے والے کو اس میں کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا؛ حالانکہ عقد اجارہ کا مطلب یہ ہے کہ فائدہ حاصل کر کے اس کے بدلے کچھ دیا جائے؛ لہذا اجرت لینے کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔

مثلاً: اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو اس لیے پیسے دیتا ہے تاکہ وہ اس کی طرف سے روزہ رکھے، وہ کافر صبح صادق سے کھانے پینے، جماع سے بچا رہے تو اسے روزہ نہیں کہا جاسکتا، نہ ہی اس سے اجرت دینے والے کا ذمہ فارغ ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو روزہ رکھنے یا نماز پڑھنے کے لیے

(۱) المبسوط ۴/ ۲۵، الشاملہ

پیسے دے، تو اس سے چونکہ پیسے دینے والے کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا، یعنی اس کا ذمہ فارغ نہیں ہوتا تو اجارہ کا مقصد ہی حاصل نہ ہوا؛ لہٰذا ان امور پر اجرت بھی لازم نہیں ہے۔

جو کام پہلے سے ذمہ میں واجب ہوں اس پر اُجرت لینا

(۲) اگر اجرت لینے والے پر وہ کام عقد اجارہ سے پہلے واجب ہو تو اس پر بھی اجرت لینا جائز نہیں، کیونکہ جو کام کسی کے ذمے واجب ہو اس پر اجرت لینا رشوت اور حرام ہے جس کی ہرگز اجازت نہیں، یہاں واجبات سے مراد عام ہے، یعنی خواہ شرعاً لازم ہوں یا کسی عقد کی وجہ سے، یا عقلا، چنانچہ ان تینوں قسم کے واجبات پر اجرت لینا جائز نہیں۔

شرعی واجبات کی مثال: قاضی کا فیصلہ کرنے پر اجرت لینا، یا مفتی کا زبانی جواب دینے پر اجرت لینا۔(۱)

عقد کی وجہ سے لازم ہونے کی مثال: مثلاً سرکاری ملازمین جس چیز کی تنخواہ لیتے ہیں اس پر الگ سے اجرت لینا۔

عقلی طور پر واجب ہونے کی مثال: اولاد کا والدین کی خدمت یا بیوی کا شوہر کی

(۱) ''استفتاء'' کا معنی ہے سوال پوچھنا، ظاہر یہی ہے کہ سائل کی مراد ''افتاء'' (یعنی فتویٰ دینے) کی اجرت کے حوالے سے سوال کرنا ہے، زبانی فتوی پوچھنے پر مستفتی سے اجرت لینا جائز نہیں، البتہ اگر مفتی کو کسی ادارے یا کسی شخص نے فتوی دینے کے لیے مقرر کیا ہو اور مفتی اس کام کے لیے باقاعدہ وقت دیتا ہو تو وہ اس ادارے یا شخص سے اجرت لے سکتا ہے، اور اگر تحریری فتوی پوچھا جائے تو مستفتی سے اجرت لینے کی گنجائش ہے، تاہم اگر مفتی ضرورت مند نہ ہو تو اجرت نہ لینا افضل ہے۔ ''(يستحق القاضي الأجر على كتب الوثائق) والمحاضر والسجلات (قدر ما يجوز لغيره كالمفتي) فإنه يستحق أجر المثل على كتابة الفتوى؛ لأن الواجب عليه الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان ومع هذا الكف أولى احترازاً عن القيل والقال وصيانةً لماء الوجه عن الابتذال، بزازية'' (الدر المختار شرح تنویر الأبصار :۶/ ۹۲، بحوالہ: دارالافتاء : جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن)

خدمت کرنے پر اجرت لینا۔

جو نیکی نہ اسلام کے ساتھ مختص ہو اور نہ کسی پر پہلے سے واجب ہو

(۳) جو نیکی نہ اسلام کے ساتھ مختص ہو اور نہ کسی پر پہلے سے واجب ہو اس کی دو قسمیں ہیں:

(ا) وہ نیکی محض ادا کرنے والے کے لیے فائدہ مند ہو، اجرت دینے والے کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو جیسے ذکر و تسبیحات، تلاوت۔

(۲) اس کام کا فائدہ صرف کرنے والے کو نہ ہو گا؛ اگر چہ جزوی طور پر اُسے بھی نفع ملتا ہو مثلاً: عربی زبان اور اس سے متعلقہ علوم و فنون کی تعلیم دینا، مسجد، خانقاہ بنانا، یا قبر کھودنا وغیرہ۔

پہلی قسم کے کاموں پر اجرت لینا ناجائز ہے اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو ان عبادات کا ہے جو اسلام کی وجہ سے عبادت جانی جاتی ہیں؛ البتہ دوسری قسم کے کاموں پر اجرت لینا درست ہے؛ مگر شرط یہ ہے کہ عقد اجارہ کے شرعی تقاضوں کا خیال رکھا جائے اور کوئی ناجائز کام شامل نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ جو طاعات شریعت نے عبادت کے طور پر مقرر کی ہیں یا جو کام کسی کے ذمے پہلے سے لازم ہو، یا جس عقد میں عقد کرنے والے کو کچھ فائدہ نہ پہنچتا ہو ان تمام امور پر اجرت لینا جائز نہیں۔

لہٰذا امامت، اذان، قرآن سکھانے پر پیسے لینا جائز نہیں تھا، فقہاء حنفیہ میں سے متقدمین کا مسلک یہی تھا؛ البتہ متاخرین فقہاء نے زمانے کی تبدیلی، لوگوں کی بے رغبتی اور بے توجہی کی وجہ سے ان کاموں پر اجرت لینے کی اجازت ہے۔ اب یہ مسئلہ متفق علیہ ہو چکا ہے کہ ان دونوں امور پر اُجرت لینا جائز ہے۔

فرض کفایہ امور پر اجرت لینے کا مسئلہ

جو امور فرض کفایہ ہیں مثلا: میت کو غسل دینا، جنازہ اٹھانا، قبر کھودنا ان کاموں پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ اس بارے میں فقہاء کرام کے اقوال مختلف ہیں:

۱۔ بعض کے نزدیک مطلقا جائز ہے۔

۲۔ بعض نے فرض ہونے کی وجہ سے مطلقا ناجائز کہا ہے۔

۳۔ بعض علماء نے اس بارے میں کچھ تفصیل بیان کی اور بظاہر یہی تفصیل درست ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: اگر یہ امور کسی کے ذمے متعینہ طور پر اس طرح لازم ہوں کہ اسے سرانجام دینے کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور نہ ہو، تو یہ اس کے ذمے فرض اور لازم ہیں اور اس پر اجرت لینا واجبات پر اجرت لینا ہے جس کا ناجائز ہونا ابھی معلوم ہوا؛ البتہ اگر یہ کام متعین طور پر کسی کے ذمے واجب نہ ہو بلکہ اس کام کی اہلیت رکھنے والا کوئی اور بھی موجود ہو تو ایسی صورت میں اس پر کچھ اجرت لینے کی گنجائش ہے، فتاوی قاضی خان میں ہے:

"و إذا استؤجر لغسل الميت قالوا لا أجر له، و كذا لو استؤجر لحمل الميت، ولو استؤجر لحفر القبر أو لدفن الميت كان له الأجر. قالوا إنما لا يجب الأجر لحمل الميت إذا لم يوجد ثمة أحد يحمل الجنازة بغير أجر فإن وجد جازت الإجارة لأن الحمل لا يجب عليه خاصة"(۱)

فرضِ کفایہ پر اُجرت کے جواز پر اشکال و جواب

اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ: فرض کفایہ امور پر اجرت لینا درست نہیں ہونا چاہئے کیونکہ متعین طور پر اگرچہ وہ کسی کے ذمے لازم نہیں ہے اور دوسرا بھی اسے ادا کرنے

---

(۱) فتاوی قاضی خان: ۳/ ۲۶۱

والا موجود ہے، تاہم فرض کفایہ ہونے کے ناطے اس کی فرضیت بہر حال ہر ایک کے ذمے برقرار ہے اور جو کوئی بھی اسے ادا کرے وہ اپنے ذمہ فرض کام کی ادائیگی کرے گا، اس پر اجرت لینا دراصل اس واجب یا فرض کام پر اجرت لینا ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ، مثلاً: ایک جگہ تیس مسلمان موجود ہیں جن میں ہر ایک مردے کو غسل دینے اور کفن پہنانے کی صلاحیت رکھتا ہے، پھر ان میں سے دو تین نے آگے بڑھ کر مردے کو غسل دیا، تو یہ جو کام انہوں نے کیا یہ بھی درحقیقت ان کے ذمے واجب کی تکمیل تھی، لہذا اس پر اجرت لینا اپنے ذمے واجب کام پر اجرت لینا ہی تصور ہوگا؛ کیونکہ بظاہر یہاں انہوں نے اپنے ذمے واجب کی ادائیگی کے علاوہ کوئی دوسرا قابل اجرت کام نہیں کیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ: بے شک یہ کام فی نفسہ واجب تھا، مگر متعین طور پر کسی ایک کے ذمے نہیں، بلکہ جو بھی اس کے ادا کرنے پر قادر ہو ان سب پر لازم تھا، اور بعینہ کسی ایک کے ذمے لازم نہ تھا، ہر ایک کے ذمے اس لیے واجب نہ تھا کیونکہ واجب کے ترک کرنے پر آدمی گنہگار ہوتا ہے جب کہ یہاں ایک شخص اگر اس میں حصہ نہ لے اور دیگر حضرات شریک ہو جائیں تو شریک نہ ہونے والے کو گنہگار نہیں کہا جاتا، الا یہ کہ کوئی ایک بھی اس میں شریک نہ ہو جائے؛ لہذا جب متعین طور پر ایک شخص کے ذمے لازم نہ ہو تو اس پر اجرت لینے کی گنجائش ہے۔

فقہ کی تعلیم یا وعظ پر اجرت لینے کا حکم

بعض کتابوں میں فقہ کی تعلیم یا وعظ پر اجرت لینے کو ناجائز کہا ہے، مبسوط میں ہے: ''اپنے بیٹے کو قرآن، فقہ یا دینی فرائض/مسائل میراث سکھانے کے لیے کسی کو اجرت پر رکھنا جائز نہیں۔

''ولایجوز أن یستأجر رجلا لیعلم ولده القرآن أو الفقه، أو

الفرائض عندنا"(۱)

فتاوی بزازیہ میں ہے: طاعات پر اجرت لینا مثلا: قرآن کریم کی تعلیم یافقہ کی تعلیم، درس اور وعظ پر اجرت لینا درست نہیں۔

"الاستئجار على الطاعات كتعليم القرآن والفقه والتدريس والوعظ لا يجوز أي لا يجب الأجر"(۲)

اس کا تقاضہ یہ ہے کہ فقہ کی تعلیم یا وعظ ونصیحت بھی طاعات میں داخل ہے اور اس پر اجرت لینا جائز نہیں، چنانچہ اس کے مطابق کئی ایک فتاوی صادر ہوئے۔

فقہ کی تعلیم سے کیا درسِ نظامی کی کتابیں پڑھانا مراد ہے؟

مگر غور وفکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فقہ کی تعلیم سے ہمارے ہاں مروجہ تعلیمی نصاب: مثلا قدوری، کنز، ہدایہ وغیرہ پڑھانا مراد نہیں، بلکہ فقہ کی تعلیم سے مراد کسی ضرورت مند سائل کو مسئلہ بتانا ہے، چونکہ اس وقت جواب دینا مفتی کی شرعی ذمہ داری ہے؛ لہذا اِس پر اُجرت لینا دراصل بذمہ واجب امور پر اجرت لینا ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ اس حدیث: "من سئل عن علم" یعنی جب کسی سے کوئی دینی مسئلہ پوچھا جائے: کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: جہاں سائل دینی امور میں رہنمائی کا محتاج ہو تو اس کے سوال کا جواب نہ دینا گناہ ہے، جہاں مفتی سے غیر ضروری مسئلہ پوچھا جائے تو اس کا جواب دینا ضروری نہیں، بلکہ اسے جواب دینے اور نہ دینے کا اختیار ہے۔

"واعلم أن المسألة التي يكون الإثم في ترك جوابها هي

---

(۱) مبسوط: ۶/ ۳۵۳

(۲) الفتاوی الہندیہ: ۴/ ۴۴۸

المسألة التي يحتاج إليها السائل في أمور دينه، أما لو سئل عن علم لا ضرورة له فيه، فلا يجب جوابه، بل يُخير المسؤول في الجواب وتركه"(۱)

لہٰذا ہمارے ہاں مروجہ فقہ یا اس سے متعلق علوم کی جو تعلیم دی جاتی ہے اس پر اجرت لینا شرعاً منع نہیں ہے، کیونکہ یہ طاعت نہ اسلام کے ساتھ خاص ہے، نہ ایسی عبادت ہے جس کا فائدہ صرف کرنے والے کو ملتا ہے، نہ شارع کی طرف سے اس پر اجرت لینے سے کوئی صریح ممانعت منقول ہے۔

مذکورہ تفصیل جس طرح فتوی یا تعلیم وتدریس کے بارے میں ہے، وعظ ونصیحت کے بارے میں بھی ہے، یعنی ہر بیان یا تقریر پر اجرت لینا ناجائز نہیں، بلکہ جہاں تقریر، وعظ یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کسی کے ذمے اس طرح لازم ہو کہ اس کے علاوہ کوئی اس فریضہ کو سر انجام نہ دے تو اس پر اجرت لینا ناجائز ہے ورنہ جائز؛ چنانچہ اگر کوئی محفل منعقد کر کے کسی خطیب کو تقریر کے لیے بلائے، تو اسے تقریر پر اجرت لینا منع نہیں ہے۔

حکومت ووزارت اور صدارت کی تنخواہ بھی محل نظر ہونی چاہئے

بعض کام انسان کے ذمے متعینہ طور پر واجب ہوتے ہیں اور اسے ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، تاہم اس میں کرنے والے کا ذاتی کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے لوگوں کے حقوق کی پاسداری اور تحفظ کے واسطہ وہ کام کرنا پڑتا ہے جیسے قضاء کا شعبہ ہو یا صدارت، وزارت کا شعبہ، اگر غور کیا جائے تو مسلمانوں کی سربراہی بھی دینی واجبات میں سے ایک ہے، کیونکہ اگر کوئی سربراہ نہ ہو تو ملک کا نظام نہیں چل سکے گا، اگر کوئی سربراہ نہ ہو اور یہ ذمہ داری عوام الناس پر ڈالی جائے تو اس سے جو نقصانات درپیش ہوں گے وہ کسی ہوشمند سے

(۱) تفسیر مظہری

پوشیدہ نہیں ہیں، بہر حال سربراہی بھی ایک واجب عمل ہے جس پر اجرت لینا ناجائز ہونا چاہیے؛ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر ان واجبات پر اجرت حرام قرار دی جائے تو چونکہ ہر انسان کے ساتھ ذاتی اور بیوی بچوں کے کئی ایک ضروریات وابستہ ہیں جن کے پورا کرنے کے واسطے ان اہم ذمہ داری کے سنبھالتے ہوئے وہ اگر کوئی اور محنت مزدوری کرنا چاہے تو بسا اوقات بلکہ اکثر ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا، تو اُجرت کو حرام ٹھہرانے کی صورت میں ان ضروریات کی کفالت کیسے ہوگی؟

جس سے ضروریات بھی پوری ہوں اور وہ رشوت اور دیگر حرام ذرائع آمدن کی طرف قدم بڑھانے سے بھی بچ سکے، اس ضرورت کو دیکھتے ہوئے مناسب یہ ہے کہ ضرورت کے بقدر ایسے لوگ وظائف وصول کریں، یہ اجرت کے زمرے میں داخل نہیں بلکہ دراصل ضروریات کا سد باب ہیں۔

بہر حال اس قسم کے مناصب پر فائز لوگ چونکہ عام مسلمانوں کی مفادات اور ان کی ضروریات میں لگے رہتے ہیں؛ لہٰذا ان کی ضروریات پوری کرنا بھی عوام کی ذمہ داری ہے، امام سرخسیؒ فرماتے ہیں: حج بدل کرنے والے کا نان نفقہ بھیجنے والے کے ذمے ہے، یہ کھانا دراصل اجرت نہیں بلکہ انسان کے ساتھ لگے ضروریات کو پورا کرنا ہے، جیسے قاضی بیت المال سے، بیوی شوہر کے مال سے اور زکوۃ وصول کرنے والا حکومت سے کچھ وظیفہ لیتا ہے، ان تمام کا دارومدار اجرت پر نہیں بلکہ دوسروں کے کام میں لگے رہنے کی وجہ سے بنیادی ضروریات کی تکمیل ہے۔

"وهذه النفقة ليس يستحقها بطريق العوض، ولكن يستحق كفايته؛ لأنه فرغ نفسه لعمل ينتفع به المستأجر فيستحق الكفاية في ماله كالقاضي يستحق كفايته في بيت المال والعامل يستحق الكفاية في مال الصدقة والمرأة تستحق

النفقة في مال الزوج لا بطريق العوض"(۱)

دینی مدارس کی اہمیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں: ''دینی تعلیم اور دینی مدارس کی اہمیت یوں تو ہر مسلم سماج میں ہے؛ لیکن خاص کر جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، جہاں ان کا دین، ان کی تہذیب ان کی سماجی روایات، ان کی شناخت نشانہ پر ہو اور جہاں گمراہی اور منکرات کے دروازے اس طرح کھلے ہوئے ہوں کہ کسی بھی شخص کے لئے کوئی رکاوٹ نہ ہو؛ بلکہ اس کا استقبال کیا جاتا ہو، وہاں دینی مدارس کی اہمیت اور زیادہ ہے؛ اسی لئے ہمارے بزرگوں نے اس ملک میں انگریزوں کے غلبہ کے بعد اور مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار نکل جانے کے پس منظر میں مدارس اسلامیہ کی بنیاد رکھی، اِس ڈیڑھ دوسو سال کے عرصہ میں ان مدارس نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ اگر چشم بصیرت موجود ہو تو نابینا بھی دیکھ لے، ان ہی مدارس نے مسلمانوں کا رشتۂ اسلام سے جوڑے رکھا ہے، ان ہی مدارس نے ان کو عیسائیت، قادیانیت اور مادیت پرستی کے ارتدادی فتنوں سے بچائے رکھا ہے، ان ہی مدارس نے شریعت کی اہمیت ان کے ذہن میں قائم رکھی ہے، ان ہی مدارس کی وجہ سے مسجدیں آباد ہیں، تمام دینی تحریکوں، جماعتوں اور مسلم تنظیموں کو ان ہی سے غذا مل رہی ہے، انھوں نے عوام میں دینی جذبات، ایمانی حمیت اور اسلامی شعور کی چنگاری کو سرد ہونے سے بچایا ہے، یہاں تک کہ مدارس ہی سے نکلنے والے افراد ہیں، جو آج ملک میں خدمت خلق، مظلوموں کی مدد، فساد سے متأثر ہونے والے افراد کا تعاون اور ان کی عدالتی پیروی جیسے کام انجام دینے میں بھی شریک یا پیش پیش ہیں، ان مدارس کے فارغین نے مسلمانوں کو بھی اعمال صالحہ کی دعوت دی ہے اور محدود پیمانہ پر سہی

---

(۱) المبسوط: ۴؍۲۵؛ بحوالہ: علمی وفقہی مقالات: ۴؍۴۲۷

برادرانِ وطن تک بھی ایمان کی دعوت پہنچائی ہے؛ اس لئے اگر کہا جائے کہ یہ ملت اسلامیہ کی شہہ رگ ہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا''۔

مسلم عوام کا جذبہ حکومتوں سے زیادہ قابل تعریف ہے

اگر عوام کی طرف سے ان اداروں کی اعانت اور تقویت وحمایت نہ ہو، تو ظاہری اسباب کے اعتبار سے مدارس کا چلنا دشوار ہو جائے گا، اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت ان مدارس کا انفراسٹرکچر سرکاری اسکولوں سے بہتر ہے اور مدارس کے دارالاقامہ کی سہولتوں کا معیار گورنمنٹ کے عصری تعلیمی اداروں کی بورڈنگ کے معیار سے بڑھ کر ہے، یہ سب عوامی تعاون کی وجہ سے ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان اپنی بہت ساری کمزوریوں کے باوجود جتنا زیادہ اللہ کے دین کے لئے، اپنی قوم کے لئے، اسلام کی سربلندی وسرفرازی اور دینی شعائر کی حفاظت کے لئے خرچ کرتے ہیں، کوئی اور قوم اس میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی؛ اس لئے ان کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے، غیر مسلم بھائی بھی اس کو محسوس کرتے ہیں۔

عوام کا اہلِ علم کے ساتھ قابل اصلاح رویّہ

عوام کا رویہ مدارس کے ذمہ داران، اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ بہتر ہونا چاہئے، عام طور پر ایسا ہی ہے؛ لیکن بعض دفعہ کچھ افسوسناک صورت حال بھی سامنے آتی ہے، اگر مدرسہ کا استاذ ہے، ذمہ دار ہے یا مسجد کا امام وموذن ہے، کل وہ سائیکل پر چلتا تھا اور آج اس کے پاس بائیک آگئی، یا فور وہیلر آگئی تو بعض خدا ناترس اصحابِ ثروت کا تبصرہ ہوتا ہے کہ فلاں صاحب کو دیکھو کہ کل تک تو سائیکل چلا رہے تھے اور آج ان کے پاؤں گاڑی سے نیچے اترتے ہی نہیں ہیں، ایسی سوچ رکھنے والے لوگ کم ہیں؛ لیکن ہیں ضرور؛ حالاں کہ عوام کا مزاج یہ ہونا چاہئے کہ ہم علماء کو اپنے سے بھی بہتر حالت میں

دیکھیں، اگر وہ اپنے کسی عالم کو دیکھیں کہ اس کے پاس اچھی گاڑی ہے، اس کے کپڑے اچھے ہیں،، ڈھنگ کا مکان اللہ نے اس کے لئے بنا دیا ہے، تو ان کو خوش ہونا چاہئے کہ ہمارے دینی رہنما ماشاء اللہ اچھی حالت میں ہیں، آپ دوسری قوموں میں دیکھیں، خاص کر یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں کہ ان کے مذہبی پیشواؤں کو کتنی زیادہ رعایتیں دی جاتی ہیں اور اکثر وہ عوام کے مقابلہ بہتر حالت میں ہوتے ہیں، ابھی اِس لاک ڈاؤن میں بعض مدارس کی مجلس انتظامی کے کچھ ارکان'' جو عوام میں سے ہیں'' کہنے لگے کہ کیا اتنے مہینے ہم گھر بیٹھ کر ان کو تنخواہ دیں گے، کیا یہاں حرام کے پیسے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ بہت بری بات ہے، ہونا تو یہ چاہئے کہ ایسے مواقع پر آپ کے لئے اپنے دینی رہنماؤں کے تئیں ہمدردی کے جذبات اور زیادہ بڑھے ہوئے ہوں۔(۱)

دینی امور پر اجرت نہ دینے کا نقصان

آج کے دور میں اگر'' خادمین دین'' پر تعاون کا دروازہ بند کر دیں گے تو گویا عملاً اُنہیں اس پر مجبور کر دیں گے کہ وہ اپنے اہلِ ذمہ کی ضروریات کی تکمیل اور کسب معاش کے لئے طلب مال کی اس ریس میں شریک ہو جائیں جو آج ہر بڑے چھوٹے کو دیوانہ کئے ہوئے ہے، جب کہ اس سے تو دین کا سخت خسارہ ہوگا، علوم اسلامی کے تعلیم و تعلّم کا سلسلہ مسدود ہو کر رہ جائے گا، مساجد میں اوقاتِ نماز کی پابندی اور اہل ولائق ائمہ و مؤذنین کی فراہمی مشکل ہو کر رہ جائے گی، اس طرح دین کی بہت سی مصلحتیں بھینٹ چڑھ جائیں گی، عدمِ جواز یا دنیاداری کے نعرے لگانے والوں کو تصویر کے اس رُخ سے غافل نہیں ہونا چاہئے، اس سلسلہ میں نصوص اور کتاب وسنت کی تصریحات کا گہرائی سے مطالعہ ہونا چاہئے۔

---

(۱) دینی مدارس اہمیت، موجودہ دشواریاں اور حل، عصرِ حاضر، جولائی ۲۰۲۰/۹ء

احادیث سے عدمِ جواز ثابت ہوتا ہے یا جواز؟

تعلیم قرآن پر اُجرت کے جائز ہونے کی جو منصوص دلیلیں اور نظیریں ہیں وہ بھی بہت قوی ہیں اور منشاءِ دین سے قریب ہیں، اس کے برخلاف جو روایات تعلیم قرآن پر اجرت کے نادرست ہونے کو بتلاتی ہیں وہ عموماً مبہم ہیں اور اس مقصد میں بے غبار نہیں، ان کی تطبیق کی یہ شکل بہت بہتر ہے کہ جس سے جائز نہ ہونا معلوم ہوتا ہے، اس کو تقویٰ پر محمول کیا جائے اور یہ حکم ان علماء کے بارے میں ہو جو اس کے ضرورت مند نہ ہوں اور اس سے مستغنی ہوں اور جہاں اجازت ہے وہ از روئے فتویٰ ہو اور ان لوگوں کے لئے ہو جو واقعی اس کے ضرورت مند ہیں۔

حالات بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں

سلفِ صالحین اور امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں علماء اور اربابِ افتاء کو اپنی ضروریات کی تکمیل اور زندگی گزارنے کے لئے بیت المال کی جانب سے وظائف، جاگیریں اور بڑی اعانتیں مقرر تھیں جس سے فراخی اور وسعت کے ساتھ ان کی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں، خلافت راشدہ کے اختتام، مملکت کی اسلامی تعلیمات سے دوری اور ہولناک نیز خدا ناترس بادشاہوں کے علما سے استغناء کی بنائی پر یہ صورت ختم ہوگئی اور ان کے لئے بظاہر اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔

متقدمین اور متاخرین کے دور کا بنیادی فرق ’’ضرورت‘‘ ہے

متقدمین کے دور میں چونکہ ائمہ کرام، موذنین اور دیگر دینی مناصب پر فائز لوگوں کی کفالت چونکہ حکومت وقت کی طرف سے ہوتی تھی، خلفاء راشدین ہو یا ان کے بعد والے ادوار کے حکمران، وہ اہل علم وفضیلت کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے تھے، ان کی ضروریات

سے زیادہ انہیں دیتے تھے، ان کے علاوہ عام لوگ بھی ان حضرات کی خدمت وتکریم کو اپنی سعادت سمجھ کر اس میں کوئی کسر نہ چھوڑتے، پھر رفتہ رفتہ حالات بدل گئے، بادشاہوں نے دینی خدمات پر خرچ کرنے سے زیادہ گارے مٹی پر خرچ کرنے کو اہم سمجھا، ان کے حقوق میں کوتاہی کرنے لگے، جس کے بعد ان حضرات کو اپنے ضروریات کے لیے کسی ذریعہ معاش، تجارت وغیرہ کی فکر دامن گیر ہونے لگی، دینی امور میں بیشتر مناصب ایسے ہیں جن کے ادائیگی کے لیے یکسوئی اور معاشی ضروریات سے بے فکری بے حد ضروری ہے، تجارت وغیرہ امور میں مشغول ہونے کے بعد وہ یکسوئی حاصل ہونا چونکہ ناممکن ہے؛ لہذا متاخرین فقہاء نے محسوس کیا کہ اگر اس طرح حالات میں ان امور پر اجرت لینے کی اجازت نہ دی جائے تو بہت جلد یہ دینی مناصب ضائع ہو جائیں گے، چنانچہ متاخرین فقہاء کرام نے اپنی خداداد بصیرت کی روشنی میں ان امور پر اجرت لینے کی اجازت دیدی۔

ظاہر ہے کہ متاخرین فقہاء کا اس مسئلے میں متقدمین کے ساتھ اصولی یا دلائل کا اختلاف نہیں تھا، بلکہ اجازت کی بنیاد ضرورت اور ان شعائر کی حفاظت تھی، چنانچہ اجازت کی بنیاد جب ضرورت ہے، جہاں ضرورت ہوگی وہاں اجازت ہوگی ورنہ نہیں؛ متاخرین کی اجازت کی آڑ میں ہر نیک کام پر اجرت جائز سمجھنا جیسا کہ بعض حضرات کی رائے ہے کہ انہوں نے تلاوت کلام پاک (ایصالِ ثواب کی قرآن خوانی) پر بھی اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے بالکل غلط اور اصول کے سراسر خلاف ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں۔(۱)

ضرورت پر اُجرت لینا

جن حضرات کے پاس دنیاوی وسائل موجود ہوں وہ بلا اُجرت صرف اجر اور اللہ کی رضا و خوشنودی کے لیے دینی علوم کی تعلیم دیں تو بہت خوب ماشاء اللہ؛ اگرچہ خدمت

(۱) علمی وفقہی مقالات: ۴/۷ ۴۲

کی وجہ سے استحقاق تو وہ بھی رکھتے ہیں؛ البتہ جن کے پاس یہ وسائل موجود نہ ہوں تو اسلام ایسے مخلص علماء کرام کو بھوکا پیاسا نہیں مارتا؛ بلکہ ایسے علماء کی کفالت اسلامی حکومت کا کام ہے کہ وہ ایسے علماء کرام اور ایسے تمام دینی اداروں کی بھی کفالت کرے اور ماضی میں یہ کام اسلامی حکومتیں ہی کرتی رہی ہیں، ضروری ہے کہ ان علماء کرام کو بھی بھر پور وظائف دیے جائیں تاکہ وہ معاش کے مسائل سے بے فکر ہو کر صرف دین کی محنت میں لگے رہیں تاکہ قرآن و حدیث کے علوم کے یہ چشمے جاری و ساری رہیں۔

جہاں ضرورت نہیں وہاں جائز نہیں

اردو کی مشہور تفسیر ''معارف القرآن'' میں ہے: ''تعلیمِ قرآن وغیرہ پر اجرت لینے کو جن متاخرین نے جائز قرار دیا ہے اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہے جس میں خلل آنے سے پورے دین کا نظام مختل ہو جاتا ہے، اس لیے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے؛ اس لیے مُردوں کو ایصالِ ثواب کے لیے ختمِ قرآن کرانا یا کوئی دوسرا وظیفہ پڑھوانا اُجرت کے ساتھ حرام ہے؛ کیوں کہ اس پر کسی دینی ضرورت کا مدار نہیں اور اُجرت لے کے پڑھنا حرام ہوا تو اس طرح پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں گنہگار ہوئے، اور جب پڑھنے والے کو کوئی ثواب نہ ملا تو میت کو کیا پہنچے گا؟ ایصالِ ثواب کے لیے قبر پر قرآن پڑھوانا، اُجرت دے کر ختم کرانا صحابہؓ و تابعینؒ اور اسلافِ امت سے کہیں منقول نہیں، اس لیے بدعت ہے۔(۱)

دینی کاموں پر اجرت کا انکار منکرین حدیث کا شیوہ ہے

امت میں دینی امور پر اجرت کا انکار صرف منکرین حدیث نے کیا ہے، اور عجیب بات

(۱) معارف القرآن: ۱/ ۲۰۸

یہ ہے کہ حدیث کا انکار بھی ہے اور اجرت کے عدم جواز پر حدیث ہی پیش کرنے لگے، جب حدیث کا مطلقاً اعتبار نہیں تو اِس مسئلہ میں حدیث حجت کیسے بن گئی ؟ نیز حدیث میں تحریف کر کے تو پیش کر دیا؛ مگر کسی محدث کا حوالہ بھی نہیں پیش کر پاتے، پتہ چلا امت کو دھوکہ دے کر دین سے دور کرنے کی گہری سازش کی گئی۔

عذابِ قبر کے منکرین نے عذابِ قبر کے علاوہ دینی امور پر اجرت کے مسئلہ کو بھی اپنا موضوع بنا رکھا ہے اور اس بات کی وہ دن رات تبلیغ کر رہے ہیں کہ دینی امور پر اجرت ناجائز ہے، اور اس سلسلہ میں کچھ عامیانہ لٹریچر بھی شائع کیا ہے جس میں کچھ روایات سے انہوں نے اجرت کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے، یہ عجیب طرفہ تماشا ہے کہ عذابِ قبر کی صحیح وصریح اور متواتر احادیث کو تو یہ فرقہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، حجیت حدیث معتبر نہیں؛ مگر جن علماء کرام نے حفاظتِ دین کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے اُن کے خلاف ظالمانہ محاذ قائم کر رکھا ہے۔

دینی کاموں پر اجرت کا انکار یہودی سازش ہے

یہ زہرافشانی اس لیے ہو رہی ہے کہ ان کی زہریلی باتوں سے متاثر ہو کر عوام محافظین دین کی خدمت چھوڑ دیں؛ بلکہ اِن پر جری ہو جائیں، جس سے عاجز آ کر علماء کرام دینی درسگاہیں بند کر کے حصول معاش میں مصروف ہو جائیں اور قرآن وحدیث کی تعلیم کا یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے، ظاہر ہے کہ جب علماء قرآن وحدیث کے دروس چھوڑ کر دنیا کی طرف راغب ہو جائیں گے اور دین کی تعلیم دینے والا کوئی باقی نہ رہے گا تو اس طرح دنیا سے قرآن وحدیث کے علوم کے سیکھنے اور سکھانے کا سلسلہ یکسر ختم ہو جائے گا اور یہود ونصاریٰ یہی کچھ چاہتے ہیں؛ جبکہ قرآن وحدیث کی تعلیم دینے والے اجرِ عظیم کے مستحق ہیں۔

اسی لیے فرمایا: ''اللہ کی کتاب اس کی زیادہ حق دار ہے کہ اس پر اجرت حاصل کی جائے۔'' اگر قرآن وحدیث کی تعلیم سے بے رغبتی اختیار کی گئی اور دنیا کے حصول کو مقصد

بنالیا گیا تو پھر دنیا میں جہالت عام ہو جائے گی اور جب قرآن و حدیث کا علم علماء کرام کے اٹھ جانے سے ختم ہو جائے گا تو پھر قیامت انتہائی قریب ہو جائے گی، انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ (دین کا) علم اٹھ جائے گا اور جہالت قائم ہو جائے گی اور شراب (کثرت سے) پی جائے گی اور زنا کھلم کھلا (اعلانیہ) ہوگا۔

"﴿ان من اشراط الساعة ان يرفع العلم ويثبت الجهل ويشرب الخمر ويظهر الزنا﴾(۱)

فضائل والوں کا مسائل میں دخل دینا اصول کے خلاف ہے

۱۔تحلیل وتحریم کا اختیار ذاتِ خدا تعالیٰ کو ہے، اس کے بعد محمد مصطفی ﷺ کو ہے، کسی عالم دین کو بھی تحلیل وتحریم کا حق حاصل نہیں ہے، علماء کسی چیز کو حرام نہیں کرتے بلکہ؛ حرام شدہ چیز کی حرمت ظاہر کرتے ہیں، یعنی علماء کا کام حرام بنانا نہیں ہے بلکہ حرام بتانا ہے، جیسے رہبر کا کام راستہ بنانا نہیں ہے، بلکہ راستہ بتانا ہے، کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا کوئی معمولی بات نہیں کہ ہر کس و ناکس اس میں طبع آزمائی کرتا پھرے؛ افسوس! کہ یہ معاملہ جس قدر حساس ہے، اُتنا ہی جاہل اور غیر سنجیدہ لوگ اس میں دل چسپی لینے لگے ہیں۔

۲۔امت میں دین کے مختلف شعبہ ہیں، ہر شعبہ والے کو اپنے شعبہ کے بانیان کے اصول کے مطابق کام کرنا چاہئے، جب بھی شعبہ میں مقرر کردہ اصول سے ہٹتے ہیں تو افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں، دعوت وتبلیغ کے ساتھیوں کو یہ اصول بتایا گیا ہے کہ "ہمیں صرف فضائل پر بولنا ہے، مسائل پر بولنا ہمارا کام نہیں ہے؛ بلکہ یہ ماہر علماء کرام کا کام ہے، جب ہمارا یہ طبقہ مسائل میں دخل دینے لگتا ہے تو غلطی ہو جاتی ہے، چنانچہ امامت، تدریس

(۱) صحیح بخاری، کتاب العلم باب رفع العلم وظہور الجہل، حدیث: ۶۸۰۸، صحیح مسلم کتاب العلم باب رفع العلم قبضہ وظہور الجہل والفتن فی آخر الزماں

وخطابت پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں ؟اور یہ دین کی خدمت ہے یا نہیں ؟ یہ طے کرنا کا دعوت وتبلیغ کے شعبہ کا کام نہیں ہے۔

۳۔جمہور امت کے نزدیک شرعی دلائل کی روشنی میں دینی اُمور پر اُجرت شرعاً جائز ہے،کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں،دینی تعلیم پر لوگ اپنی خوشی سے تحفۃً اس کی خدمت کریں،تو وہ اُجرت نہیں،رسولِ اکرم ﷺ بھی معلمِ کائنات تھے،آپ ﷺ کو بھی تحفے پیش کیے جاتے تھے اور آپ ﷺ انہیں قبول فرمایا کرتے تھے،امت مسلمہ نے اجماعی طَور پر ان تحائف کے جائز ہونے کا فیصلہ دیا ہے۔

۴۔جولوگ اہل علم کے ساتھ کسی بھی قسم کے مالی تعاون کو مطلقاً ناجائز وحرام قرار دیتے ہیں، نیز اس کے جواز کے قائلین کو دین فروش،دوکان دار، وغیرہ القاب سے''نوازتے'' ہیں،انہیں خوف کرنا چاہیئے کہ اُن کی اس بے ادبی وگستاخی ؛بلکہ حماقت کے نتیجہ میں سب سے پہلے پیغمبر اسلام ﷺ ، پھر صحابہ کرام اوراسلافِ اُمت اور ہر دَور کے اولیاء،فقہاء ومحدثین آتے ہیں،جنہوں نے دینی تعلیم کی اُجرت کے بھی جواز کا فتویٰ دیااور دینی تعلیم وتربیت کی وجہ سے ملنے والے تحائف کو بھی قبول کیا۔

رزق اور اُجرت کے درمیان فرق

''رزق'' اور''اجرت'' (تنخواہ یا مزدوری) میں فرق ہے،اور یہ فرق شرعی،لغوی اور مفہومی لحاظ سے واضح ہے۔

رزق کے لغوی وشرعی معنی: رزق کا مطلب ہے: عطا کرنا،روزی دینا،کسی کو فائدہ پہنچانا،شرعی و دینی مفہوم ہے: رزق وہ نعمت ہے جواللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بھی مخلوق کو دی جاتی ہے،خواہ وہ انسان ہو یا حیوان،مومن ہو یا کافر۔

* رزق میں کھانا، پانی، کپڑا، مکان،اولاد، مال،علم،صحت، عزت،سکون، وقت، محبت،حتیٰ کہ ایمان بھی بلکہ بعض اوقات کسی چیز کا فائدہ بھی رزق شمار ہوتا ہے، جیسے نفع

بخش علم یا صبر، قرآن مجید میں فرمایا:

”وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي ٱلۡأَرۡضِ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ رِزۡقُهَا“(۱)

اجرت کے لغوی و عمومی معنیٰ: اجرت کا مطلب ہے: کام کے بدلے میں دی جانے والی رقم یا نفع، اجرت وہ چیز ہے جو کسی خدمت یا کام کے بدلے انسان، ادارہ یا آجر کی طرف سے دی جاتی ہے، یہ ایک معاوضہ ہوتا ہے، مثلاً: کسی استاد کی تنخواہ، کسی مزدور کی دیہاڑی، ڈاکٹر یا انجینئر کی فیس، کرایہ دار سے مکان کا کرایہ۔

رزق ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جس میں ہر نفع بخش چیز شامل ہے جو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔

* اجرت ایک معاوضہ ہے جو کسی خاص خدمت یا کام کے بدلے انسان دیتا ہے۔

* ہر اجرت رزق ہو سکتی ہے؛ لیکن ہر رزق اجرت نہیں ہوتا، دونوں میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے۔

رزق اللہ کی طرف سے ہے:

”وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي ٱلۡأَرۡضِ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ رِزۡقُهَا“(۲)

* ہر مخلوق کا رزق اللہ کے ذمے ہے، چاہے وہ انسان ہو یا حیوان۔

* رزق صرف محنت سے نہیں، بلکہ اللہ کی مشیت و فضل سے بھی ہے، اللہ جسے چاہے، بغیر حساب رزق دیتا ہے:

”يَرۡزُقُ مَن يَشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ“(۳)

رزق انسان کی کوشش کا محتاج نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے طے شدہ ہے، رزق

---

(۱) سورہ ہود: ۶

(۲) سورۃ ہود: ۶

(۳) سورۃ آل عمران: ۳۷

انسان کو تلاش کرتا ہے جیسے موت کرتی ہے: اگر انسان اپنے رزق سے ایسے بھاگے جیسے موت سے بھاگتا ہے، تو رزق بھی ویسے ہی اسے پالے گا جیسے موت پاتی ہے۔"لو أن ابن آدم هرب من رزقه كما يهرب من الموت لأدركه رزقه كما يدركه الموت"(۱)

رزق کا تعین پیدائش سے پہلے ہو چکا ہوتا ہے: تم میں سے ہر ایک کا رزق، اس کی ماں کے پیٹ میں روح پھونکنے سے پہلے ہی لکھ دیا جاتا ہے

"قال ﷺ:إن أحدكم يُجمع خلقه في بطن أمه أربعين يوماً... ثم يُنفخ فيه الروح، ويُكتب رزقه وأجله..."(۲)

اجرت انسان کا شرعی حق ہے؛ لیکن وہ اللہ کے رزق کے نظام کا حصہ ہے۔

حاصل یہ کہ رزق وہ سب کچھ ہے جو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے، چاہے انسان نے محنت کی ہو یا نہ کی ہو۔

اجرت انسان کی محنت یا خدمت کے بدلے میں انسانوں سے ملنے والا معاوضہ ہے۔

اجرت بھی رزق کا حصہ ہے؛ لیکن رزق اجرت سے بہت وسیع تر ہے، اس واضح فرق کے باوجود بعض مدعیانِ تنظیموں، کمیٹیوں اور صدور حضرات کا یہ زعم باطل ہو جانا چاہئے کہ وہ علماء وائمہ کرام کے روزی کے ذمہ دار ہیں، ورنہ ہر گاہک تاجر کی روزی کا ذمہ دار کہلائے گا کہ اس کی خریداری سے تاجر کا گھر چل رہا ہے۔

احمد اللہ نثار قاسمی

خادم دارالعلوم رشیدیہ حیدرآباد

۲؍صفر المظفر ۱۴۴۷ھ

---

(۱) فیض القدیر للمناوی، حدیث: ۷۴۰۱

(۲) صحیح بخاری، حدیث: ۳۲۰۸

دینی امور پر اجرت کا جواز
احادیث و آثار کی روشنی میں

توضیحِ مسئلہ

مسلمان خود اپنی عبادت کرنے کے بدلے میں اجرت نہ لے، اور جو شخص اپنی عبادت کے بدلے میں دنیاوی اجرت چاہے تو اللہ تعالی کے ہاں اس کیلیے کوئی اجر نہیں ہے، اگر عبادت ایسی ہو کہ جس کا فائدہ دوسروں کو بھی ہو جیسے کہ قرآن کریم کے ذریعے دم کرنا، یا قرآن کریم کی تعلیم دینا، یا حدیث وفقہ کی تعلیم دینا، یا امامت کرنا تو جمہور علمائے کرام کے یہاں ایسی عبادت پر اُجرت لینا جائز ہے، یہ اُجرت اصل میں نماز یا قرآن پڑھانے کی نہیں ہوتی؛ بلکہ ان کاموں کے لیے اپنے آپ کو محبوس اور دیگر کاموں سے فارغ رکھ کر وقت دینے کی ہے۔

علامہ، عبد الرحمن بن ابو بکر، سیوطیؒ ابو اللیث سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (دینی) تعلیم تین طرح کی ہوتی ہے، ایک وہ جو صرف نیکی کی نیت سے دی جائے اور اس کا معاوضہ نہ لیا جائے، دوسری وہ جو اُجرت لے کر دی جائے اور تیسری وہ جو بغیر کسی شرط کے دی جائے، لیکن جب تحفہ دیا جائے تو اسے قبول کرلیا جائے، پہلی قسم کی تعلیم پر اجر ملتا ہے اور انبیاے کرام کا عمل اسی پر تھا، دوسری قسم میں اختلاف ہے، لیکن راجح اس کا جائز ہونا ہی ہے، تیسری قسم کے جائز ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانیت کے لیے معلّم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تحفہ قبول فرمایا کرتے تھے۔

"اَلتَّعْلِيمُ عَلٰى ثَلَاثَةِ أَوْجُهٍ، أَحَدُهَا لِلْحِسْبَةِ، وَلَا يَأْخُذُ بِهِ عِوَضًا، وَالثَّانِي أَنْ يُعَلِّمَ بِالْأُجْرَةِ، وَالثَّالِثُ أَنْ يُعَلِّمَ بِغَيْرِ شَرْطٍ، فَإِذَا أُهْدِيَ إِلَيْهِ قَبِلَ، فَالْأَوَّلُ مَأْجُورٌ، وَعَلَيْهِ عَمَلُ الْأَنْبِيَاءِ، وَالثَّانِي مُخْتَلَفٌ فِيهِ، وَالْأَرْجَحُ الْجَوَازُ، وَالثَّالِثُ يَجُوزُ إِجْمَاعًا، لِأَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وآله وسلم كَانَ مُعَلِّمًا لِلْخَلْقِ، وَكَانَ يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ"۔(۱)

(۱) الاتقان فی علوم القرآن: ۱/ ۳۵۷، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتب

دینی کاموں پر اجرت کی پہلی دلیل

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''اصحابِ رسول کا گروہ ایک چشمے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے لوگوں کے پاس سے گزرا، ان میں سے کسی شخص کو موذی جانور نے ڈس لیا تھا، ان کا ایک آدمی صحابہ کرام کے پاس آیا اور پوچھا: کیا تم میں کوئی دَم کرنے والا ہے؟ چشمے کے پاس پڑاؤ کرنے والوں میں ایک شخص کو کسی موذی جانور نے کاٹ لیا ہے، ایک صحابی گئے اور بکریوں کے عوض سورۂ فاتحہ پڑھ کر دَم کیا تو وہ شفایاب ہوگیا، وہ بکریاں لے کر دوسرے صحابہ کے پاس آئے تو انہوں نے اس کام کو ناپسند کیا اور (اعتراض کرتے ہوئے) کہا: آپ نے قرآنِ کریم پر اُجرت لی ہے! حتی کہ جب وہ مدینہ منورہ واپس آئے تو رسولِ اکرم ﷺ سے عرض کیا: اللہ کے رسول! اس شخص نے کتا اللہ پر اُجرت لی ہے، اس پر رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: جن چیزوں پر تمہارا اُجرت لینا جائز ہے، ان میں سب سے اولیٰ کتاب اللہ ہے۔

''إِنَّ نَفَرًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ مَرُّوا بِمَاءٍ، فِيهِمْ لَدِيغٌ أَوْ سَلِيمٌ، فَعَرَضَ لَهُمْ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْمَاءِ، فَقَالَ: هَلْ فِيكُمْ مِنْ رَاقٍ، إِنَّ فِي الْمَاءِ رَجُلًا لَدِيغًا أَوْ سَلِيمًا، فَانْطَلَقَ رَجُلٌ مِنْهُمْ، فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ عَلٰى شَاءٍ، فَبَرَأَ، فَجَاءَ بِالشَّاءِ إِلٰى أَصْحَابِهِ، فَكَرِهُوا ذٰلِكَ، وَقَالُوا: أَخَذْتَ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ أَجْرًا، حَتّٰى قَدِمُوا الْمَدِينَةَ، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَخَذَ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ أَجْرًا، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: 'إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا، كِتَابُ اللّٰهِ''۔(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الطب، باب الشرط فی الرقیۃ بقطیع من الغنم، حدیث: ۵۷۳۷

اختلاف کے موقع پر اللہ و رسول ﷺ کی طرف رجوع کریں

اس حدیث سے واضح ہوا کہ جب دم کرنے والے صحابی نے وہ بکریاں لے لیں تو دوسرے صحابہ کرام ؓ نے ان سے اختلاف کیا اور ان سے کہا کہ تم نے کتاب اللہ پر اجرت لی ہے؛ چنانچہ صحابہ کرام نے یہ تمام واقعہ نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا "ان حق ما أخذتم علیه أجرا كتاب الله" (جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں کتاب اللہ سب سے زیادہ مستحق ہے (کہ اس پر اجرت لی جائے) صحابہ کرام کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ جب ان میں کسی بات پر اختلاف ہو جاتا تو وہ اس کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ سے کروایا کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ پر وہ راضی ہو جاتے، اور یہی ایمان خالص ہے کہ ایک مومن اللہ اور اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کر لے، رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کے اس عمل کو درست قرار دیا اور فرمایا: "قد اصبتم" (تم نے بالکل دست کیا) (بخاری) اور ابو داؤد کی روایت میں ہے "احسنتم" (تم نے اچھا کیا)

فائدہ: مذکورہ بالا حدیث سے ثابت ہوا کہ (۱) دم پر اجرت لینا جائز ہے اور یہ حدیث اس مسئلہ پر نص قطعی کا درجہ رکھتی ہے۔ (۲) اس واقعہ کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے ایک عام اصول اور قاعدہ بھی بیان فرمایا اور وہ یہ ہے: "ان احق ما اخذتم علیه اجرا كتاب الله" جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں اللہ کی کتاب سب سے زیادہ مستحق ہے کہ اس پر اجرت لی جائے، اس حدیث نے یہ مسئلہ واضح کر دیا کہ دم کے علاوہ تعلیم القرآن وغیرہ پر بھی اجرت لی جا سکتی ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اجتہاد

حدیث کے طلبہ جانتے ہیں کہ امام بخاری ؒ کا ترجمۃ الباب بہت اہمیت رکھتا ہے، باب کے تحت ذکر کی جانے والی احادیث کا ترجمۃ الباب سے مطابقت کرنا اور فقہ البخاری

مستقل سمجھنے کی بات ہوتی ہے، آپؒ نے اس حدیث کو "کتاب الاجارۃ" اور "کتاب الطب" میں شامل کیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم اور دینی امور پر اجرت لینے کے جواز کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

امام حاکمؒ کا قول

باب کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ آثار نقل کئے کہ" امام حاکم کا قول ہے "لم أسمع أحدا کرہ أجر المعلم" میں سے کسی (عالم) شخص نے یہ نہیں سنا کہ معلم کی اجرت کو اس نے ناپسند کیا ہو "واعطی الحسن دراھم عشرۃ" اور امام حسن بصری نے (معلم کو) دس درہم اجرت کے دیے، ان احادیث اور آثار کو ذکر کرنے سے امام بخاری کا مقصد یہی ہے کہ تعلیم القرآن پر اجرت جائز ہے"۔

امام ابن العربی المالکیؒ کا قول

امام ابن العربی المالکیؒ (المتوفی ۵۴۳ھ) سیدنا ابو سعید الخدریؓ کی روایت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس حدیث سے قرآن پر اجرت لینے کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اس کی تائید صحیح بخاری کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں کتاب اللہ سب سے زیادہ مستحق ہے کہ تم اس پر اجرت حاصل کرو۔

﴿جواز أخذ الأجرۃ علی القرآن وقد أتبعه بقوله فی الصحیح ان أحق ما أخذتم علیه أجرا کتابُ اللہ﴾(۱)

حافظ ابن حجرؒ کا قول

حافظ ابن حجر العسقلانیؒ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جمہور علماء

---

(۱) عارضة الاحوذی بشرح صحیح الترمذی ۸/۱۶۸، طبع دار الکتب العلمیة بیروت

کرام نے اس حدیث سے تعلیم القرآن پر اجرت لینے کے جواز پر استدلال کر کے اجرت کو درست قرار دیا ہے۔

"واستدل به للجمهور فی جواز اخذ الاجرة علی تعلیم القرآن"(۱)

ابن بطالؒ کا قول

شارحِ صحیح بخاری، علامہ، ابو الحسن، علی بن خلف، ابن بطال رحمہ اللہ (متوفی ۴۴۹ھ) اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: "دَم کے معاوضے اور قرآنِ کریم کی تعلیم پر اُجرت میں کوئی فرق نہیں، کیوں کہ دونوں معاملات منفعت پر مبنی ہیں، نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اُجرت لینے کے حوالے سے سب سے بہترین چیز کتاب اللہ ہے، یہ فرمان عام ہے اور اس میں تعلیم وغیرہ پر اُجرت کا جواز بھی شامل ہے۔

"وَلَا فَرْقَ بَيْنَ الْأَجْرَةِ عَلَى الرُّقٰى وَعَلٰى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ، لِأَنَّ ذٰلِكَ كُلَّهُ مَنْفَعَةٌ، وَقَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا، كِتَابُ الله' هُوَ عَامٌّ، يَدْخُلُ فِيهِ إِبَاحَةُ التَّعْلِيمِ وَغَيْرُهُ"۔(۲)

علامہ عینیؒ کا قول

مشہور حنفی، علامہ، ابو محمد، محمود بن احمد، عینی (متوفی ۸۵۵ھ) صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں: اس حدیث کی باب کے عنوان سے مطابقت اس طرح سے ہے کہ اس میں قرآنِ کریم پڑھ کر، اس کی تعلیم دے کر اور اس کا دَم کر کے اُجرت لینے کا جواز

(۱) فتح الباری کتاب الاجارة ۴/۴۵۴

(۲) شرح صحیح البخاری: ۶/۴۰۶، مکتبۃ الرشد، الریاض ۲۰۰۳ء

ہے، کیوں کہ حدیث کے الفاظ میں عموم ہے۔

”مُطَابَقَتُهُ لِلتَّرْجَمَةِ مِنْ حَيْثُ إِنَّ فِيهِ جَوَازَ أَخْذِ الْـأُجْرَةِ لِقِرَائَةِ الْقُرْآنِ، وَلِلتَّعْلِيمِ أَيْضًا، وَلِلرُّقْيَا بِهِ أَيْضًا لِعُمُومِ اللَّفْظِ“۔(۱)

علامہ صنعانی ؒ کا قول

علامہ محمد بن اسماعیل، امیر صنعانی ؒ (متوفی ۱۱۸۲ھ) لکھتے ہیں: امام بخاری ؒ نے اس قصہ کو قرآنِ کریم پر اُجرت کے بیان میں ذکر کیا ہے۔ اگر چہ اس حدیث میں تعلیم پر اُجرت کا بیان نہیں ہوا؛ لیکن اس میں قرآنِ کریم پڑھنے کے بدلے معاوضہ لینے کا ذکر ضرور ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیم یا کسی دوسرے مقصد (علاج) کے لیے قرآنِ کریم کی قراءت پر اُجرت جائز قرار دینے کے لیے اس حدیث کو بیان کیا ہے؛ کیوں کہ تعلیم یا علاج کے لیے قرآنِ کریم پڑھنے میں کوئی فرق نہیں۔

”وَذِكْرُ الْبُخَارِيِّ لِهٰذِهِ الْقِصَّةِ فِي هٰذَا الْبَابِ، وَإِنْ لَّمْ تَكُنْ مِّنْ الْـأُجْرَةِ عَلَى التَّعْلِيمِ، وَإِنَّمَا فِيهَا دَلَالَةٌ عَلٰى جَوَازِ أَخْذِ الْعِوَضِ فِي مُقَابَلَةِ قِرَائَةِ الْقُرْآنِ، لِتَأْيِيدِ جَوَازِ أَخْذِ الْـأُجْرَةِ عَلٰى قِرَائَةِ الْقُرْآنِ تَعْلِيمًا أَوْ غَيْرَهٗ، إِذْ لَا فَرْقَ بَيْنَ قِرَاءتِهٖ لِلتَّعْلِيمِ وَقِرَائَتِهٖ لِلطِّبِّ“۔(۲)

امام شافعی ؒ کا فتویٰ

اہل سنت کے سرتاج، امام شافعی ؒ (متوفی، ۲۰۴ھ) سے نقل کرتے ہوئے امام ترمذی ؒ (متوفی، ۲۷۹) لکھتے ہیں: امام شافعی ؒ نے معلم کے لیے رخصت دی ہے

(۱) عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری: ۱۲/۹۵، دار إحیاء التراث العربی، بیروت

(۲) سبل السلام فی شرح بلوغ المرام: ۲/۱۱۷، دار الحدیث

کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کے عوض اجرت لے سکتا ہے، وہ اس کے لیے (پیشگی) طے کرنا بھی جائز سمجھتے ہیں، امام صاحب نے اسی حدیث سے استدلال فرمایا ہے۔

"وَرَخَّصَ الشَّافِعِيُّ لِلْمُعَلِّمِ أَنْ يَّأْخُذَ عَلٰى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ أَجْرًا، وَيَرٰى لَهُ أَنْ يَّشْتَرِطَ عَلٰى ذٰلِكَ، وَاحْتَجَّ بِهٰذَا الْحَدِيثِ"۔(۱)

امام خطابیؒ کا قول

فقیہ و محدث، حافظ، ابو سلیمان، حمد بن محمد، خطابیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) لکھتے ہیں: اس حدیث میں قرآنِ کریم کی تعلیم پر اُجرت لینے کا جواز بیان ہوا ہے، اگر یہ حرام ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کو یہ بکریاں واپس کرنے کا حکم فرماتے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس فعل کو درست قرار دیا اور فرمایا کہ تم نے اچھا کیا ہے، نیز اس اُجرت کو بھی پسند فرمایا جو انہوں نے لی تھی، مزید یہ بھی فرمایا کہ اپنے ساتھ میرا حصہ بھی نکالو، تو ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دینی اُمور پر اُجرت بہر صورت جائز ہے۔

"وَفِي هٰذَا بَيَانُ جَوَازِ أَخْذِ الْأُجْرَةِ عَلٰى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ، وَلَوْ كَانَ ذٰلِكَ حَرَامًا لَّأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ صلى الله عليه وآله وسلم بِرَدِّ الْقَطِيعِ، فَلَمَّا صَوَّبَ فِعْلَهُمْ، وَقَالَ لَهُمْ: أَحْسَنْتُمْ، وَرَضِيَ الْأُجْرَةَ الَّتِي أَخَذُوهَا لِنَفْسِهِ، فَقَالَ: اضْرِبُوا لِي مَعَكُمْ بِسَهْمٍ ثَبَتَ أَنَّهُ طِلْقٌ مُبَاحٌ"۔(۲)

حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا قول

حافظ، علی بن احمد بن سعید، ابن حزمؒ (متوفی ۵۱۶ھ) فرماتے ہیں: قرآنِ کریم اور حدیث کی تعلیم پر ماہانہ یا یک مشت اُجرت لینا سب جائز ہے، نیز دَم کرنے، مصا

(۱) سنن الترمذی تحت الحدیث: ۲۰۶۳

(۲) معالم السنن: ۳/۱۰۱، المطبعۃ العلمیۃ حلب ۱۹۳۲ء

حف (قرآنِ کریم) لکھنے اور کتب اِحادیث کی کتابت کرنے کی اُجرت بھی جائز ہے، کیوں کہ اس سے ممانعت کی کوئی دلیل (وحی الٰہی میں) وارد نہیں ہوئی، اس کے برعکس اس کا جواز ثابت ہے، جیسا کہ امام بخاریؒ کی سند سے ہمیں بیان کیا گیا ہے۔

"وَالْإِجَارَةُ جَائِزَةٌ عَلٰى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ، وَعَلٰى تَعْلِيمِ الْعِلْمِ، مُشَاهَرَةً وَّجُمْلَةً، وَكُلُّ ذٰلِكَ جَائِزٌ، وَعَلَى الرَّقْيِ، وَعَلٰى نَسْخِ الْمَصَاحِفِ، وَنَسْخِ كُتُبِ الْعِلْمِ، لِأَنَّهُ لَمْ يَأْتِ فِي النَّهْيِ عَنْ ذٰلِكَ نَصٌّ، بَلْ قَدْ جَائَتِ الْإِبَاحَةُ، كَمَا رُوِّينَا مِنْ طَرِيقِ الْبُخَارِي"(۱)

امام بغویؒ کا قول

حافظ، ابو محمد، حسین بن مسعود، بغوی رحمہ اللہ (م 516 ھ) فرماتے ہیں: اس حدیث میں دلیل ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیم پر اُجرت لینا اور اسے طے کرنا جائز ہے، امام عطاء بن ابو رباح اور امام حکم بن عُتَیبہ کا یہی مذہب ہے، امام مالک، امام شافعی اور ابو ثور رحمہم اللہ یہی فرماتے ہیں، امام حکم تو فرماتے ہیں: میں نے کسی بھی فقیہ کو دینی اُمور پر اُجرت کو مکروہ کہتے نہیں سنا، اس حدیث میں یہ دلیل بھی ہے کہ قرآنِ کریم اور ذکرِ الٰہی کے ساتھ دم کیا جا سکتا ہے اور اس پر اُجرت لینا بھی جائز ہے۔

"فِي الْحَدِيثِ دَلِيلٌ عَلٰى جَوَازِ أَخْذِ الْأُجْرَةِ عَلٰى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ، وَجَوَازِ شَرْطِهِ، وَإِلَيْهِ ذَهَبَ عَطَائٌ، وَالْحَكَمِ، وَبِهِ قَالَ مَالِكٌ، وَالشَّافِعِيُّ، وَأَبُو ثَوْرٍ، قَالَ الْحَكَمُ: مَا سَمِعْتُ فَقِيهًا يَكْرَهُهُ، وَفِيهِ دَلِيلٌ عَلٰى جَوَازِ الرُّقْيَةِ بِالْقُرْآنِ، وَبِذِكْرِ اللّٰهِ،

(۱) المحلّٰی بالآثار: ۱۸/۷، دار الفکر، بیروت

وَأَخْذِ الْـأُجْرَةِ عَلَيْهِ"۔(۱)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

شارحِ صحیح مسلم، حافظ، ابوزکریا، یحییٰ بن شرف، نووی ؒ (متوفی ،۶۷۶ھ) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ''نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان کہ اُن سے بکریاں لے لو اور اپنے ساتھ میرا بھی حصہ نکالو، اس بات میں صریح ہے کہ سورۃ فاتحہ اور ذکر اِلٰہی کے ذریعے دَم کرنے کی اُجرت لینا جائز و حلال ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں، یہی حکم قرآنِ کریم کی تعلیم کا بھی ہے، امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام اسحاق (بن راہویہ)، امام ابوثور رحمہم اللہ علیہم، دیگر اسلاف اور بعد میں آنے والے اہل علم کا یہی مذہب تھا۔

"قَوْلُهُ ﷺ: "خُذُوا مِنْهُمْ، وَاضْرِبُوا لِي بِسَهْمٍ مَّعَكُمْ' هٰذَا تَصْرِيحٌ بِجَوَازِ أَخْذِ الْـأُجْرَةِ عَلَى الرُّقْيَةِ بِالْفَاتِحَةِ وَالذِّكْرِ، وَأَنَّهَا حَلَالٌ، لَا كَرَاهَةَ فِيهَا، وَكَذَا الْـأُجْرَةُ عَلٰى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ، وَهٰذَا مَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ، وَمَالِكٍ، وَّأَحْمَدَ، وَإِسْحَاقَ، وَأَبِي ثَوْرٍ، وَآخَرِينَ مِنَ السَّلَفِ، وَمَنْ بَعْدَهُمْ"۔(۲)

علامہ قرطبیؒ کا قول

مشہور مفسر، علامہ، ابوعبد اللہ، محمد بن احمد، قرطبی ؒ (متوفی ،۶۷۱ھ) لکھتے ہیں : قرآنی تعلیم پر اُجرت لینے کو امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، ابوثورؒ اور اکثر علما جائز قرار دیتے ہیں؛ کیوں کہ صحیح بخاری میں مذکور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی دَم والی حدیث میں آپ ﷺ کا یہ فرمان مذکور ہے کہ سب سے بہترین اُجرت وہ ہے جو کتاب

(۱) شرح السنۃ: ۸/۲۶۸، المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۸۳ء

(۲) المنہاج شرح مسلم بن الحجاج: ۱۴/۱۸۸، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، 1392ھ

اللہ پر لی جائے، یہ فرمانِ نبوی نص ہے، جو اختلاف کو ختم کر رہی ہے، لہٰذا اس پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔

"وَأَجَازَ أَخْذَ الْـأُجْرَةِ عَلٰى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ مَالِكٌ وَّالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ وَأَبُو ثَوْرٍ وَّأَكْثَرُ الْعُلَمَاءِ، لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ ــ حَدِيثِ الرُّقْيَةِ ــ: 'إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ'، أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ، وَهُوَ نَصٌّ يَّرْفَعُ الْخِلَافَ، فَيَنْبَغِي أَنْ يُّعَوَّلَ عَلَيْهِ۔"(۱)

امام بیہقیؒ کا قول

امام بیہقی اس حدیث کا ذکر کر کے فرماتے ہیں: اور ابن عباسؓ کی حدیث کتاب اللہ کی تعلیم وغیرہ پر اجرت لینے کے جواز کے سلسلے میں عام ہے اور جب کتاب اللہ کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے تو جائز ہے کہ تعلیم قرآن مہر مقرر ہو اور حدیث ابن عباسؓ حدیث عبادہ سے زیادہ صحیح ہے۔(۲)

"﴿وهو عام فی جواز أخذ الأجرة علی كتاب الله تعالیٰ بالتعليم وغيره واذا جاز أخذ الأجرة عليه جاز أن يكون مهر اً، و حديث ابن عباس أصح من حديث عبادة۔۔۔﴾(۳)

علامہ آلوسیؒ کا قول

علامہ سید محمد آلوسی الحنفی (المتوفی ۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں: اکثر شافعی علماء کا کہنا ہے

(۱) الجامع لأحكام القرآن، تفسیر القرطبی: ۱/۳۳۵، دار الكتب المصرية، القاهرة 1964

(۲) تعلیم قرآن کو حق مہر شمار کرنے سے متعلق احناف کا موقف آگے آرہا ہے۔

(۳) معرفة السنن والآثار: ۵/۳۸۱

کہ رسول اللہ ﷺ خمس (اور مال فے) کو مسلمین کے بھلائی کے کاموں میں استعمال فرمایا کرتے تھے، جیسے دشمن کی سرحد پر پہرہ دینے والوں اور شہروں میں مقرر کیے گئے قاضی حضرات اور وہ علماء جو شرعی علوم کی تحصیل میں مشغول ہوں اور اس کے آلات اور اگر چہ ان آلات کو ایجاد کیا گیا ہو، اور اماموں اور مؤذنین کے لیے اگر چہ وہ امیر ہوں اور وہ تمام لوگ جو مسلمین کے بھلائی کے کاموں میں لگے ہوئے ہوں اور ان کے عمومی نفع کی وجہ سے ان تمام کو مال خمس اور مال فے میں سے وظائف دیے جاتے تھے۔

"﴿والا کثرون من الشافعية ان ما كان له ﷺ من خمس الخمس يصرف لمصالح المسلمين كالثغور و قضاة البلاد والعماء المشتغلين بعلوم الشرع وآلاتها ولو مبتدئين والائمة والمؤذنين ولو اغنيا وسائر من يشتغل عن نحو كسبه بمصالح المسلمين لعموم نفعهم﴾ (۱)

مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول

مولانا خلیل احمد سہارنپوری فرماتے ہیں: اس حدیث میں رقیہ اور طب پر اجرت لینے کی بہت بڑی دلیل ہے جیسا کہ امام شافعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد نے کہا اور رہی تعلیم القرآن پر اجرت تو جمہور نے اس حدیث کی بناء پر اس کی اجازت دی ہے اور صحیح بخاری کی یہ روایت "بیشک جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں اللہ کی کتاب اجرت لینے کی زیادہ مستحق ہے۔" (بھی اس کی دلیل ہے) اور امام ابوحنیفہ نے اجرت کو حرام قرار دیا ہے جیسا کہ ابن رسلان نے کہا۔ میں (خلیل احمد) کہتا ہوں لیکن متاخرین حنفیہ نے ضرورت کی بناء پر اجرت کی اجازت دی ہے۔)

---

(۱) روح المعانی ۱۴/۴۶ پ ۲۸

﴿وفی الحدیث اعظم دلیل علی ان یجوز الاجرۃ علی الرقی والطب کما قالہ الشافعی ومالک وابو حنیفہ واحمد واما الاجرۃ علی تعلیم القرآن فاجازھا الجمہور بھذا الحدیث وبروایۃ البخاری ان احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللہ وحرمہ ابو حنیفہ قالہ ابن رسلان قلت ولکن اجازہ متاخرو الحنفیہ لضرورۃ﴾(۱)

کیا یہ تمام حضرات دین کا کام نہیں کیے؟

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ رقیہ پر تمام علماء کا اجماع ہے اور تعلیم القرآن پر جمہور کا اتفاق ہے، یعنی امت کے علماء کی اکثریت تعلیم القرآن پر اجرت کی قائل ہے اور اس سلسلے میں جو روایات آئی ہیں ان کے صحیح ہونے پر بھی پوری امت کا اتفاق ہے؛ البتہ جن روایات کو ممانعت کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے وہ نہ تو صحیح ہیں اور نہ ہی اس مسئلہ میں صریح ہیں۔

جو لوگ ''دینی کاموں پر اجرت کو حرام کہتے ہوں یا دینی کاموں پر اجرت لینے سے وہ دینی کام دین نہیں رہتے بلکہ وہ دنیوی کام ہو جاتے ہیں'' انہیں ڈرنا چاہئے کہ وہ لوگ امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام بخاری رحمہم اللہ سمیت سب اسلافِ امت کی شان میں بے ادبی وگستاخی کے مرتکب ہیں، اُنہیں اپنی ایمانی حالت کی فکر کر لینی چاہئے، جبکہ مذکورہ تمام ائمہ دین صحیح بخاری کی احادیث سے دینی اُمور پر اُجرت کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔

مذکورہ حدیث سے استدلال پر پہلا اعتراض کہ یہ حق ضِیافت تھا

بعض لوگ اس حدیث سے صریحاً ثابت ہونے والے مسئلے کا انکار کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ بکریاں دَم کی اُجرت کے طور پر نہیں بل کہ حق ضیافت کے طَور پر لی گئی تھیں،

(۱) بذل المجہود فی حل ابی داؤد، ج۶ ص ۱۱

کیوں کہ انہوں نے ضیافت کرنے سے انکار کر دیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم کسی قوم کے پاس پڑاوَ ڈالو اور تمہیں مہمان کے شایانِ شان ضیافت مل جائے تو قبول کرلو، اگر وہ ایسا نہ کریں تو اُن سے حق مہمان (زبردستی) لو۔

"إِنْ نَزَلْتُمْ بِقَوْمٍ، فَأُمِرَ لَكُمْ بِمَا يَنْبَغِي لِلضَّيْفِ، فَاقْبَلُوا، فَإِنْ لَمْ يَفْعَلُوا، فَخُذُوا مِنْهُمْ حَقَّ الضَّيْفِ"۔(۱)

نبی ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس بات کی تعلیم دی ہوئی تھی کہ اگر کوئی قبیلہ ان کی ضیافت نہ کرے تو وہ کسی طور سے حق ضیافت وصول کرلیں، لہٰذا اس حدیث کے پیش نظر مذکورہ واقعہ میں صحابہ کرام نے بکریاں وصول کیں، کیونکہ اس دور میں آج کل کی طرح ہوٹلوں وغیرہ کا رواج نہیں تھا۔

۱۔ پہلی بات: ایسا کہنا رسول اللہ ﷺ کے واضح الفاظ کے صریحاً خلاف ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے صریح الفاظ میں نہ صرف قرآنِ کریم کی اُجرت کہا، بل کہ اسے بہترین اُجرت بھی قرار دیا، اس کو ضیافت کہنے والے لوگ حدیث کے صرف ان الفاظ کا ترجمہ کر دیں: "إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ"۔ (سب سے زیادہ اُجرت لینے کے لائق اللہ کی کتاب ہے) یہ ضیافت ہے یا اجرت ہے؟ یعنی آپ ﷺ اِسے اُجرت شمار کرتے ہیں اور معترض اس کو حق ضیافت شمار کرنے لگا ہے، جب نبی اکرم ﷺ اسے قرآن کی اُجرت قرار دے رہے ہیں تو کسی اُمتی کا اسے حق ضیافت قرار دینا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ اگر اس کو حق ضیافت مانیں اور قرآنِ کریم کی اُجرت نہیں تو پھر نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہوگا، جو آپ ﷺ نے واقعہ سننے کے بعد ارشاد فرمایا۔

۲۔ دوسری بات: اس حدیث کے کسی بھی طریق میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں جس سے صحابہ کرام کا حق ضیافت کے طور پر بکریاں لینا ثابت ہوتا ہو، نیز کسی محدث نے حدیث کی

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب قصاص المظلوم، حدیث: ۲۴۶۱

تشریح میں اس کو حق ضیافت نہیں لکھا ہے، چودہ صدیوں بعد حدیث کے ابجد سے نابلد لوگ حدیث کی تشریح کرنے چلیں تو محدثین کی شان میں کس قدر توہین لازم آئے گی۔

۳۔تیسری بات : چاروں مسالک کے فقہاے اسلام نے اسے دَم کی اُجرت ہی قرار دیا ہے،حق ضیافت شمار نہیں کیا۔

۴۔چوتھی بات : یہ تو صحیح ہے کہ قبیلہ والوں نے صحابہ کرام کی ضیافت سے انکار کر دیا تھا مگر یہ دعویٰ کہ صحابہ کرام نے دراصل ان قبیلہ والوں سے حق ضیافت وصول کیا تھا تو یہ نرا دعویٰ ہی ہے اور اس کی کوئی دلیل ان روایات میں موجود نہیں، صحیح مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے ان قبیلہ والوں نے صحابہ کرام کی دودھ سے تواضع فرمائی جس سے یہ ثابت ہوگیا کہ قبیلہ والوں کو جب بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے دودھ سے صحابہ کرام کی خاطر مدارت کی اور حق ضیافت کو ادا کیا۔

۵۔پانچویں بات: اس حدیث پر عمل کی صورت میں تو صحابہ کرام، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمانِ مبارک پر عمل کرتے ہوئے اُن لوگوں سے فوراً اور زبردستی حق ضیافت وصول کر لیتے، اپنا حق وصول کرنے کے لیے دَم کر کے بکریاں لینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی،صحابہ کرامؓ کی جب انہوں نے ضیافت نہ کی تو وہ وہاں سے روانہ ہونے لگے اور پھر دم والا واقعہ پیش آیا اور صحابہ کرامؓ نے دم پر اجرت بھی وصول کی، اگر اُن کے سردار کو موذی جانور نہ ڈستا تو کیا صحابہ کرام مذکورہ بالا فرمانِ نبوی کی (معاذ اللہ) مخالفت ہی کرتے اور حق وصول نہ کر پاتے۔

۶۔چھٹی بات: واقعہ اگرچہ کے خاص ہے مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمانِ گرامی عام ہے؛ اگر بالفرض بکریاں وصول کرنا حق ضیافت بھی تھا، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان قرآنِ کریم کی اُجرت کو جائز قرار دے رہا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے الفاظ صرف اُسی واقعہ کے ساتھ تو خاص نہیں ہیں؛ چنانچہ اصول ہے کہ ”**العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص**

السبب "اعتبار لفظوں کا ہوتا ہے، سبب کا نہیں، اگر شانِ ورود کا اعتبار کرنے لگ جائیں تو قرآن کی جتنی بھی آیتیں ہیں یہ ساری مکہ کے مشرکوں کے لیے ہی ہیں! یا صحابہ کرام کے لیے ہیں یا مدینہ کے یہودیوں عیسائیوں کے لیے ہیں، ہمارے لیے تو کچھ بھی نہیں، اگر اسباب نزول وورود کا اعتبار کرنا ہے پھر تو ہم سارے آزاد ہو گئے، اعتبار کیا جاتا ہے الفاظ کا کہ الفاظ کیا ہیں، الفاظ رسول اللہ ﷺ دم کے بارے میں نہیں ہیں، مطلقاً ہیں، جن جن کاموں پر اجرت لینا جائز ہے، ان سب کاموں میں سے سب سے زیادہ حق دار کتاب اللہ ہے، تو لہٰذا یہ اعتراض بھی بالکل فضول ہے، چنانچہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"فَأَجَابَ أَصْحَابُنَا ۔۔۔ حَقُّ الضَّيْفِ لَازِمٌ، وَلَمْ يُضَيِّفُوهُمْ، ،
قُلْتُ :إِنَّمَا نَأْخُذُ بِعُمُومِ قَوْلِهِ ﷺ، لَا بِخُصُوصِ السَّبَبِ،
وَقَدْ قَالَ: "إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُم عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللهِ"۔(۱)

پھر موجودہ زمانے کی دینی امور اجرت کے درست ہونے پر یہ ارشاد کیوں دلیل نہیں بن سکتا ہے۔

۷۔ساتھویں بات : اگر یہ حق ضیافت ہی تھا تو آپ ﷺ سفر میں شریک نہیں تھے، پھر اُس حق ضیافت میں اپنا حصہ کیوں رکھنے کا حکم فرمایا، کیا حق ضیافت کے حلال ہونے میں بھی شبہ تھا، جس کی وجہ سے آپ ﷺ نے اپنا حق شامل کر کے اُس شبہ کو ختم فرمایا؟ ہاں اجرتِ قرآن پر شبہ تھا جس کی خاطر آپ ﷺ نے اپنا حصہ شامل فرما کر اس کے حلال ہونے کی وضاحت فرمائی۔

۸۔آٹھویں بات: امام بخاری نے "کتاب الادب باب اکرام الضیف" میں اس حدیث کو وارد کیا ہے، اگر اس مسئلہ کا کچھ بھی تعلق ان احادیث کے ساتھ ہوتا تو امام

(۱) تنقيح التحقيق في أحاديث التعليق ۲:۱۳۲/۲، دار الوطن، الرياض ۲۰۰۰ء

بخاری وہاں بھی اس حدیث کو وارد کر دیتے جیسا کہ امام صاحب کی عادت ہے اور وہ ایک حدیث سے کئی مسائل اخذ کرتے ہیں، اس باب میں امام بخاری نے ابراہیمؑ کے مہمانوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کا واقعہ قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں آیا ہے اور ابراہیمؑ نے ان کی خاطر مدارت کی تھی۔

۹۔دسویں بات : امام احمدؒ نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ جس علاقہ میں مہمان کو قیمتاً کھانا نہ مل سکتا ہو، کیونکہ وہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے تو وہاں لوگوں پر مہمان نوازی فرض ہے اور امام لیثؒ کے نزدیک ہر جگہ کے لوگوں پر فرض ہے، لیکن جمہور کے نزدیک مہمان نوازی سنت مؤکدہ ہے، فرض نہیں ہے؛ اس لیے حق ضیافت جبراً وصول نہیں کیا جاسکتا، الایہ کہ مہمان لاچار ہو اور بھوک ستا رہی ہو علاوہ ازیں صحیح بات تو یہ ہے اس کا تعلق، اسلامی حکومت کے کارندوں سے تھا کیونکہ اس وقت وسائل اتنے عام نہیں تھے، حکومت ہر جگہ ان کے لیے کھانے اور رہائش کا انتظام کرسکتی، لیکن اب حکومت اس کا انتظام کرتی ہے، انہیں اس کے لیے رقم مہیا کرتی ہے، اس لیے اب جائز نہیں، اور نہ ایک دو مہمان کسی سے اپنا حق زبردستی وصول کرنے کی استطاعت کہاں رکھتے ہیں۔(۱)

حاصل یہ کہ (۱) یہ کہنا نبی اکرم ﷺ کے واضح ارشادات کے برخلاف ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے صراحتاً اسے قرآن کی اجرت قرار دیا اور اس اجرت کو بہترین کہا۔

(۲) حدیث کے کسی بھی طریق میں صحابہ کے حق ضیافت کے طور پر بکریاں لینے کا ذکر نہیں ہے۔

(۳) اسلاف امت نے اسے دم کی اجرت ہی قرار دیا ہے، نہ کہ حق ضیافت، اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اگر کسی شخص نے آپ پر احسان کیا ہو تو آپ اس کا کام بلا معاوضہ بھی کر

---

(۱) تحفۃ المسلم شرح صحیح مسلم، حدیث :۴۵۶۱

دیتے ہیں؛ لیکن اگر کسی نے کسی مصیبت کے وقت میں باوجود قدرت کے آپ کے کام آنے سے انکار کر دیا ہو، اس کی ضرورت کے وقت آپ اپنا معاوضہ معمول سے زیادہ وصول کرتے ہیں تو یہ معاوضہ ہی ہوگا نہ کہ ضیافت و احسان کا بدلہ۔

دوسرا اعتراض کہ یہ معاوضہ کافروں سے لیا گیا تھا!

معترضین ایک اعتراض یہ کر دیتے ہیں کہ یہ معاوضہ تو کافروں سے لیا گیا تھا اور اہل علم تو مسلمانوں سے دینی اُمور پر اُجرت لیتے ہیں، یعنی دینی کاموں پر اجرت کافروں سے لینا جائز ہے مسلمانوں سے لینا جائز نہیں ہے۔

۱۔ پہلا جواب: یہ ہے کہ اگر یہی بات ہے کہ کافروں سے دینی اُمور پر اُجرت لینا جائز ہے، تو پھر دینی اُمور پر اُجرت کی حرمت کا استدلال کرتے ہوئے سب سے پہلے وہ آیات سناتے ہیں جن میں انبیاے کرام نے کافروں سے فرمایا: ہم تم سے اس تبلیغ دین پر کسی اُجرت کا سوال نہیں کرتے۔ ”قُل لَّآ أَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ أَجۡرًا إِلَّا ٱلۡمَوَدَّةَ فِي ٱلۡقُرۡبَىٰ“ گویا اِس حدیث کو ردّ کرنے کے لیے جو جواب دیا اس سے قرآن مجید سے تعارض لازم آیا کہ قرآن مجید میں کفار سے ہی یہ خطاب ہوا کہ میں تم سے اجر نہیں لوں گا، اور یہاں صحابہ کرام نے کفار سے ہی اجرت وصول کی۔

۲۔ دوسرا جواب: یہ ہے کہ سیدنا علاقہ بن صحار رضی اللہ عنہ کی حدیث، جس میں دَم پر سو بکریاں لینے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسے حق و جائز قرار دینے کا ذکر ہے، اس میں دَم کروانے والے لوگ مسلمان ہی تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دینی تعلیم کو خیر قرار دیا تھا، چنانچہ:

خارجہ بن صلت رحمہ اللہ اپنے چچا صحابیِ رسول، علاقہ بن صحار رضی اللہ عنہ، سے بیان کرتے ہیں: ”وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اِقدس میں حاضر ہوئے (اور مسلمان ہو گئے)، پھر واپس لوٹے تو ایک قوم کے پاس سے گزرے، ان کے ہاں ایک پاگل شخص تھا، جسے

لوہے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اس کے گھر والوں نے کہا : ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارا یہ ساتھی دینی تعلیم لے کر آیا ہے، کیا اس کے پاس کوئی ایسا دَم ہے، جس سے یہ اس کا علاج کر سکے؟ وہ صحابی کہتے ہیں: میں نے اسے تین دن سورۃ فاتحہ کا دَم کیا، روزانہ (صبح و شام) دو مرتبہ (اپنی تھوک جمع کر کے پھونک دیتا تھا) وہ شفایاب ہوگیا، اس پر انہوں نے مجھے سَو بکریاں دیں، میں رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ ماجرا سنایا، آپ ﷺ نے فرمایا: بکریاں لے لیجیے، مجھے قسم ہے، جو لوگ باطل پر مبنی دَم کر کے کماتے ہیں (آپ ان میں سے نہیں)، یقیناً آپ نے تو حق پر مبنی دَم کر کے کمایا ہے۔

"إِنَّهُ أَتَى رَسُولَ اللهِ ﷺ، ثُمَّ أَقْبَلَ رَاجِعًا مِّنْ عِنْدِهِ، فَمَرَّ عَلٰى قَوْمٍ، عِنْدَهُمْ رَجُلٌ مَّجْنُونٌ مُّوثَقٌ بِالْحَدِيدِ، فَقَالَ أَهْلُهُ :إِنَّا قَدْ حُدِّثْنَا أَنَّ صَاحِبَكُمْ هٰذَا قَدْ جَاءَ بِخَيْرٍ، فَهَلْ عِنْدَهُ شَيْئٌ يُدَاوِيهِ؟ قَالَ :فَرَقَيْتُهُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ [قَالَ وَكِيعٌ :] ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، كُلَّ يَوْمٍ مَّرَّتَيْنِ، فَبَرَأَ، فَأَعْطَوْنِي مِائَةَ شَاةٍ، فَأَتَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَأَخْبَرْتُهُ، فَقَالَ :'خُذْهَا، فَلَعَمْرِي مَنْ أَكَلَ بِرُقْيَةِ بَاطِلٍ، لَقَدْ أَكَلْتَ بِرُقْيَةِ حَقٍّ"۔(۱)

۳۔ تیسرا جواب: ہر دور کے شارحین اور ہر دور کے فقہاء اسی حدیث کے تحت میں اجرت کے جواز کو جہاں ثابت مانا ہے وہاں اجرت دینے والے کفار تھے یا مسلم حکمران؟ حلت وحرمت کا مسئلہ کفار کے لئے ہے یا مسلمانوں کے لئے؟ اگر اجرت حرام ہے تو خواہ کسی سے بھی وصول کریں ،وصول تو قرآن کے مقابلہ میں ہی ہو رہی ہے پھر کفار سے لینا کیسے درست ہو جائے گا؟ علامہ، ابو محمد، محمود بن احمد، عینیؒ اس حدیث

(۱) مسند إمام أحمد: ۳۶/ ۱۵۵، حدیث: ۲۱۸۳۵، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۲۰۰۱ء؛ سنن أبي داود، کتاب الطبّ، باب کیف الرقی؟، حدیث: ۳۸۹۶، سندہ حسنٌ

کو ذکر کر کے لکھتے ہیں: اس حدیث سے کئی مسائل کا استنباط ہوتا ہے۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ قرآنِ کریم پر اُجرت لینا جائز ہے۔

"وَيُسْتَنْبَطُ مِنْهُ أَحْكَامٌ: جَوَازُ أَخْذِ الْأُجْرَةِ عَلَى الْقُرْآنِ"۔(۱)

تیسرا اعتراض کہ یہ غیر معمولی واقعہ تھا، اس کا عموم سے تعلق نہیں

یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور اس خاص موقع پر صحابہ کرام نے ان قبیلہ والوں سے اجرت کا معاملہ صرف ان کی بے مروتی سے ناراض ہونے کی وجہ سے کیا تھا، ضیافت کرنے سے انکار کر دیا تو اس صورتحال میں اس کے سوا اور کیا چارہ تھا کہ ان سے حق ضیافت کسی بھی طرح وصول کر لیا جاتا یہ تو اضطراری حالات کا تقاضہ تھا اور حالت اضطراری میں ایسا قدم اٹھانے کی اجازت ہے۔

پہلا جواب: یہ بات اس حد تک درست ہے کہ صحابہ کرام نے قبیلہ والوں کی بے مروتی کی وجہ سے ان سے دم پر اجرت لی تھی، لیکن نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُم عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ الله "جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں اللہ کی کتاب اجرت لینے کی زیادہ مستحق ہے۔(بخاری) اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "قد اصبتم" (تم نے بالکل درست کام کیا ہے) (بخاری ومسلم) اور ابوداؤد کی روایت میں "احسنتم" (تم نے اچھا کیا) <u>آپ ﷺ کا درست قرار دینا بھی کیا مجبوری کی حالت میں تھا؟ جواز کا استدلال صحابہ کرام کی مجبوری سے نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔</u>

دوسرا جواب: اگر مجبوری واضطراری کی حالت مان بھی لی جائے تو حالتِ اضطراری میں شان انبیاء یہ ہے کہ معاوضہ نہ لیا جائے، چنانچہ حضرت موسیٰؑ، خضرؑ کے ساتھ ایک بستی میں

---

(۱) نخب الأفكار في تنقيح مباني الأخبار في شرح معاني الآثار ۱۶: ۳۵۷، وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، قطر ۲۰۰۸ء

پہنچے اس بستی کے لوگوں نے کہنے کے باوجود ان کے کھانے کے اہتمام نہ کیا، خضرؑ نے جب ان کی ایک دیوار کو جو گرنے والی تھی سیدھا کر دیا تو موسیٰؑ نے فوراً ان سے فرمایا: ''لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا'' (۱) یہاں بھی مجبوری تھی ؛مگر مجبوری میں حق ضیافت وصول نہ کیا، بلکہ مزید احسان کر دیا، معلوم ہوا کہ اس کو اضطراری حالت کا بدلہ قرار دینا محل نظر ہے۔

تیسرا جواب: قرآن کریم کی بعض سورتیں یا آیات کسی خاص پس منظر میں نازل ہوئیں ؛لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ چونکہ ان آیات کا فلاں واقعہ کے ساتھ تعلق ہے لہٰذا انہیں انہی واقعات کے ساتھ ہی مخصوص سمجھا جائے بلکہ خاص واقعات کے تحت نازل ہونے والی آیات میں جو احکامات نازل کیے گئے وہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے مشعل راہ ہیں، اسی طرح اس واقعہ کے نتیجہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک عام حکم صادر فرمادیا﴿إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُم عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللهِ﴾ اور یہ اہل ایمان کے لیے قیامت تک کے لیے ایک قانون کی شکل اختیار کر گیا کہ اللہ کی کتاب پر اجرت وصول کی جا سکتی ہے، چاہے تعلیم قرآن وحدیث ہو اور چاہے دم کا معاملہ ہو، بہر حال ان تمام امور پر اجرت وصول جا سکتی ہے۔

دینی امور پر اجرت کے جواز کی دوسری دلیل قرآن کی تعلیم بطور حق مہر

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ اس نے اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہبہ کر دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے (مزید) عورتوں میں کوئی رغبت نہیں، ایک صحابی نے عرض کیا: اس عورت سے میری شادی کر دیجیے! آپ ﷺ نے فرمایا: اسے (حق مہر میں) کوئی کپڑا دے دو، ان صحابی نے عرض کیا: میرے پاس کپڑا نہیں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا

(۱) الکھف: ۷۷

: اسے کوئی چیز ضرور دو، خواہ لوہے کی انگوٹھی ہی ہو، انہوں نے پھر معذرت کر لی تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم کو قرآن کتنا یاد ہے؟ صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: فلاں فلاں سورت! آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمھارے ساتھ اس عورت کی شادی اس قرآن کے عوض کر دی ہے جو تمہیں یاد ہے۔

''أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ امْرَأَةٌ، فَقَالَتْ :إِنَّهَا قَدْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ ﷺ، فَقَالَ :'مَا لِي فِي النِّسَاءِ مِنْ حَاجَةٍ'، فَقَالَ رَجُلٌ :زَوِّجْنِيهَا، قَالَ :'أَعْطِهَا ثَوْبًا'، قَالَ ؛ لاَ أَجِدُ، قَالَ :'أَعْطِهَا، وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيدٍ'، فَاعْتَلَّ لَهُ، فَقَالَ: 'مَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ؟'، قَالَ: كَذَا وَكَذَا، قَالَ: 'فَقَدْ زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ''۔(۱)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی

اس صحابی کے بارے میں، جسے نبی اکرم ﷺ نے حفظ قرآن کے عوض نکاح کا حکم فرمایا تھا، امامِ مدینہ، مالک بن انس رضی اللہ عنہ (متوفی ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں کہ یہ قرآن سکھانا (حق مہر کے لیے) بطورِ اُجرت تھا۔

''فِي الَّذِي أَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَنْكِحَ بِمَا مَعَهُ مِنَ الْقُرْآنِ، أَنَّ ذٰلِكَ فِي أُجْرَتِهِ عَلٰى تَعْلِيمِهَا مَا مَعَهُ''۔(۲)

(۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیرکم من تعلّم القرآن وعلّمہ، حدیث :۵۰۲۹؛ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وجواز کونہ تعلیم قرآن، حدیث: ۱۴۲۵

(۲) التمهيد لما في المؤطّأ من المعاني والأسانيد لابن عبد البرّ ۲۱:۱۲۰/۱، وزارة عموم الأوقاف والشؤون الإسلامية، المغرب، ۱۳۸۷ء، سندهٗ حسنٌ

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی

امام شافعیؒ (متوفی، ۲۰۴ھ) کے بارے میں امام بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امام شافعی رحمہ اللہ نے دینی تعلیم پر اُجرت لینے کے جواز پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے، جس میں قرآنِ کریم کی تعلیم پر شادی کرنے کا ذکر ہے۔

"وَاحْتَجَّ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى فِي جَوَازِ أَخْذِ الْأُجْرَةِ عَلٰى تَعْلِيمِ الْخَيْرِ بِحَدِيثِ التَّزْوِيجِ عَلٰى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ"۔(۱)

امام بیہقی کا فتوی

۱۔ امام، ابوبکر، احمد بن حسین، بیہقیؒ (متوفی، ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں: قرآنِ کریم کی تعلیم کے عوض نکاح والی حدیث دینی اُمور پر اُجرت کے جواز کی دلیل ہے۔

"وَحَدِيثُ الْمُزَوَّجَةِ عَلٰى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ، دَلِيلٌ فِيهِ"۔(۲)

۲۔ نیز امام بیہقیؒ قرآن پر نکاح والی حدیث کا ذکر کرنے کے بعد عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: امام بخاریؒ نے اس حدیث کو "سیدان عن یوسف" کی سند سے ذکر کیا اور یہ حدیث کتاب اللہ کی تعلیم وغیرہ پر اجرت کے جواز کے لیے عام ہے اور جب کتاب اللہ پر اجرت جائز ہے تو جائز ہے کہ وہ مہر کا بدل بن سکے، یعنی تعلیم القرآن کو مہر کا بدل قرار دیا جاسکتا ہے۔

رواہ البخاری فی الصحیح عن سیدان عن یوسف وھو عام فی جواز اخذ الاجرۃ علی کتاب اللہ تعالیٰ بالتعلیم وغیرہ۔

---

(۱) مختصر خلافیات للبیہقی لأبی العبّاس الشافعی: ۴/ ۲۷۱، مکتبۃ الرشد، الریاض ۱۹۹۷ء

(۲) السنن الکبریٰ: ۶/ ۲۰۵، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۲۰۰۳ء

و اذا جاز اخذ الا جرة علیه جاز ان یکون مهر﴾(۱)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا قول

اس حدیث پر امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ’’اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیم قرآن کا مہر ہونا جائز ہے اور تعلیم قرآن پر اجرت لینا بھی جائز ہے، امام شافعیؒ اور عطاؒ اور حسن بن صالحؒ اور امام مالکؒ اور امام اسحاقؒ وغیرہم کا یہی مذہب ہے۔

’’و في هذا الحديث دليل لجواز كون الصداق فعليم القران وجوازالاستيجار التعليم ال قران وكلاهما جائز عند ا لشافيي به قال عطاء والحسن بن صالحو مالك و اسحاق وغيرهم‘‘(۲)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اجتہاد

۱۔امام بخاریؒ نے کتاب النکاح میں ’’باب التزویج علی تعلیم القرآن‘‘ (تعلیم القرآن کے عوض نکاح کرنے کا بیان) قائم کیا ہے، جس سے انہوں نے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے تعلیم القرآن پر اجرت لینا جائز ہے، امام بخاریؒ نے ’’کتاب الاجارة‘‘ کے باب کے تحت سب سے پہلے سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث کے یہ آخری الفاظ نقل کیے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ’’کتاب اللہ سب سے زیادہ اس کی مستحق ہے کہ تم اس پر اجرت حاصل کرو۔ ﴿ان احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب الله﴾ پھر امام بخاریؒ نے امام الشعبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: معلم تعلیم پر کوئی شرط نہ لگائے البتہ جو کچھ اسے بن مانگے دیا جائے وہ اسے لے لے۔ ﴿لا یشترط المعلم الا ان یعطی شیئا فلیقبله﴾

---

(۱) معرفۃ السنن والآثار: ۳۸۱/۵

(۲) صحیح مسلم: ۴۵۸/۱

۲۔امام بخاریؒ نے اس حدیث پر یہ باب بھی قائم کیا ہے "باب التزویج علی القرآن وبغیر صداق" (قرآن کے عوض نکاح کرنا اور بغیر مہر کے) حافظ ابن حجر العسقلانیؒ اس باب کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "مطلب یہ ہے کہ تعلیم القرآن کے عوض اور بغیر ظاہری مال کے نکاح کرنا۔"

۳۔علامہ سندھیؒ کہتے ہیں "علی مامعک ای علی تعلیمها" یعنی جو قرآن آپ کے پاس ہے اور جس کی آپ اسے تعلیم دیں گے۔

کیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تنخواہ کے قائل نہیں تھے؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ جس طرح امام بخاریؒ نے جوازِ اجرت کا باب قائم فرمایا اسی طرح ایسا باب بھی قائم فرمایا جس سے حرمت کا ثبوت ہوتا ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب باندھا ہے "باب من رائ القرآن أو تأكل به أو فجر به" اس آدمی کے گناہ کا بیان ،جس نے قرآن مجید کے ساتھ ریا کاری کی، یا اس کو کمائی کا ذریعہ بنایا یا اس کے ذریعے کوئی گناہ والا کام کیا،اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ بھی قرآن پر اجرت لینے کے قائل نہیں تھے۔

امام بخاریؒ نے کتاب البیوع کے اندر باب باندھا کہ "باب ما یعطی فی الرقیة علی احیاء العرب بفاتحة الکتاب، وقال ابن عباس عن النبي ﷺ :إن أحق ما أخذتم علیه اجرا کتاب الله" امام بخاریؒ نے یہ باب بھی باندھا ہے جس میں بیان کیا ہے کہ دم کرنے کی فیس اور تنخواہ لی جاسکتی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نبی کریم ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ کتاب اللہ پر اجرت لینا جائز ہے،تو اس بات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید پر اجرت لینے کے قائل تھے۔،رہا مذکورہ باب میں امام صاحب فرماتے ہیں : "من رائ" جس آدمی نے ریا کاری کی "بقرأة القرآن" لوگوں کو دکھانے کے لیے قرآن پڑھا تو ہم بھی کہتے ہیں کہ ریا کاری کے لیے قرآن پڑھنا ناجائز ہے،کوئی بھی کام ہو ریا شکاری

کر کے ضائع ہو جاتا ہے، ریاکاری کر کے لوگوں سے داد اور پیسے وصول کرنا غلط ہے، ہم نے کب اس کو جائز کہا ہے؟"أو فجر به" یا قرآن کے ساتھ گناہ والا کام کرتا ہے، ہاں! قرآن کے ذریعے گناہ والا کام کرنا بالکل ناجائز اور غلط ہے، لیکن اس باب کا زیرِ بحث مسئلہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

آزادی کو مہر بنانے سے موافقت

مذکورہ حدیث سے تعلیم قرآن کو مہر بنانا درست معلوم ہوا، اسی طرح دوسری حدیث سے عتق یعنی آزادی کو مہر بنانا درست معلوم ہوتا ہے، چنانچہ مالک اگر اپنی لونڈی کو غلامی سے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے اور اس آزادی کو مہر قرار دے ڈالے تو یہ بھی جائز ہے۔ چنانچہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد فرمایا اور ان سے نکاح کر لیا اور ان کو آزادی کو ان کا مہر قرار دیا۔

﴿ان رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعتق صفية وجعل عتقيا صداقها﴾(۱)

دونوں مسئلوں میں موافقت اس طرح ہے کہ لونڈی خود مال ہے، اسے فروخت کر کے مال حاصل کیا جاتا ہے یہاں آزادی کو مہر کا بدل قرار دیا گیا گویا آزادی مال ہے جو مہر شمار ہوئی، اسی طرح تعلیم القرآن پر مالی عوض درست ہے، یہاں تعلیم قرآن کو مہر کا بدل قرار دیا گیا ہے، یعنی اگر شوہر کسی خاتون کو قرآن کی تعلیم دیتا تو اسے اجرت ملتی، وہ اُس اجرت کو مہر میں دے سکتا تھا، گویا اسی تعلیم کو مہر قرار دیا گیا، معلوم ہوا کہ تعلیم قرآن پر اجرت جائز ہے، قرآن گویا اس مال کا بدل ہے جو مہر میں مقرر کیا جاتا ہے اور چونکہ قرآن کے سکھانے میں محنت کرنی پڑتی ہے؛ لہٰذا اس محنت کے عوض مال و دولت (تنخواہ) لی جا سکتی ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب المغازی باب اتخاذ السراری، کتاب النکاح باب من اعتق جاریة ثم تزوجها، صحیح مسلم کتاب النکاح باب فضیلة اعتاق الامة ثم یزوجها

قرآن مجید کو مہر قرار دینے سے نکاح ہوا یا نہیں؟

عدم جواز کے قائلین سے معلوم کریں کہ آپ ﷺ نے جو نکاح بعوض تعلیم قرآن فرمایا وہ ہوگیا تھا یا نہیں؟ اور زوجین نے اس نکاح پر زندگی گذاری یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے، تو مدعا ثابت ہوا کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینی اور عورت سے نکاح کرنا اور دیگر منافع حاصل کرنے جائز ہیں، اگر یہ نکاح ناجائز ہے؛ کیونکہ اجرت اور مہر ناجائز چیز کو باندھ دیا گیا، پھر تو یہ اللہ کے رسول ﷺ اور شریعت مطہرہ پر حملہ ہے، نبی پر اعتراض کے بعد اسلام کا دعویٰ بھی محل نظر ہوگیا۔

حدیثِ ام سلیمؓ سے اعتراض

مذکورہ دونوں حدیثوں پر تیسری حدیث سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب تعلیم قرآن مال کا بدل ہوا، آزادی بال کا بدل ہے تو قبول اسلام بھی مال کا بدل ہونا چاہئے ،چنانچہ انسؓ فرماتے ہیں کہ ابوطلحہؓ نے ام سلیم سے نکاح کیا، ان کے درمیان ابوطلحہؓ کا اسلام لانا مہر قرار پایا، ام سلیمؓ ابوطلحہؓ سے پہلے اسلام لے آئیں تھیں، جب ابوطلحہؓ نے ان کو نکاح کا پیغام دیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں اگر تم اسلام قبول کرلو تو میں تم سے نکاح کرلوں گی، ابوطلحہؓ نے اسلام قبول کرلیا، یہی ان کا مہر قرار پایا۔

"تزوَّج أبو طلحةَ ، أمَّ سلَيمٍ ، فكان صَداقُ ما بينهما :الإسلامَ ، أسلمتْ أمُّ سلَيمٍ ، قبل أبي طلحةَ فخطَبها ، فقالت :إنِّي قد أسلمتُ ، فإن أسلمتَ نكحتُك ، فأسلم ، فكان صَداقَ ما بينهما"(۱)

معترض نے اس حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام

(۱) نسائی، کتاب النکاح باب التزویج علی الاسلام، حدیث: ۳۳۴۰، سندہ صحیح

قبول کرنے پر مال و دولت لینا جائز ہوا یا مال و دولت کے عوض اسلام قبول کرنا مستحسن قرار پایا، جبکہ اسلام قبول کرنے کی تو کوئی قیمت ہی نہیں لگائی جا سکتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں تالیف قلب کے لئے زکوۃ دینے کی اجازت ہے "والمؤلفة قلوبهم "اس کا کیا مطلب لیا جائے گا؟ اسلام کی طرف راغب کافر و مشرک یا نیا نیا اسلام قبول کرنے والوں کی اگر مالی اعانت کی جائے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ان لوگوں نے مال و دولت کے لیے اسلام قبول کیا تھا؟ اعتراض کرنے والوں کو اپنی کم علمی پر رونا چاہئے، ایک دور وہ تھا کہ اسلام کے چاہنے والوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی اسلام کو سینہ سے لگائے رکھا اور پھر ایک ایسا دور بھی آیا کہ انہی صحابہ کرام نے اسلامی برکت سے قیصر و کسریٰ کے خزانوں کو حاصل کیا، قیصر و کسریٰ کے خزانے حاصل کرنے والوں کے متعلق کیا فتویٰ لگائیں گے؟ دین کی برکت سے اللہ تعالیٰ اگر اہل ایمان کو مالا مال کر دے تو اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ کیا جہاد کے ذریعے جو مال غنیمت حاصل ہوتا ہے معترض اس کے بھی منکر ہیں؟ قرآن کو نبی ﷺ نے مہر کے طور پر مقرر فرمایا اور قرآن گویا اس مال کا بدل ہے جو مہر میں مقرر کیا جاتا ہے اور چونکہ قرآن کے سکھانے میں محنت کرنی پڑتی ہے؛ لہٰذا اس محنت کے عوض مال و دولت (تنخواہ) لی جا سکتی ہے۔

البتہ درمیان میں اس مسئلہ کی بھی وضاحت ہو جائے کہ موجودہ دور میں شوہر کی خدمت یا تعلیم قرآن کو مہر بنانے سے مہر ادا ہو جائے گا یا مہر مثل واجب ہوگا؟ یہ مسئلہ ائمہ کرام کے مابین مختلف فیہ؛ مگر اس اختلاف سے تعلیم قرآن کے اُجرت کے جواز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا:

حضرت موسیٰؑ کا بکریاں چرانا بطورِ مہر ہونا

مہر کی تعریف: عقد نکاح کی وجہ سے شوہر کو بیوی سے جماع کرنے کا حق اور ایک طرح کی ملکیت حاصل ہوتی ہے، مہر اسی حق و ملکیت کے معاوضہ کا نام ہے، جس کی

ادائیگی شوہر پر شرعاً لازم ہے۔

"اسم للمال الذي يجب في النكاح على الزوج في مقابلة البضع الخ"(۱)

شریعت اسلامیہ میں مہر کے لیے مال متقوم (وہ مال جو جمع کیا جا سکتا ہو اور شرعا اس سے نفع اٹھانا مباح ہو) کا ہونا ضروری ہے خدمت وغیرہ مہر نہیں ہو سکتی اس صورت میں مہر مثل واجب ہوگا اور سابقہ شریعت کا وہ حکم ہم پر لازم ہوتا ہے جس کے فسخ یا منسوخ ہونے پر کوئی دلیل قائم نہ ہو لہذا سورۃ القصص کی اس مذکورہ آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی خدمت کی شرط لگائی تھی نہ کہ اپنی بیٹی کی خدمت کے لیے اور منفعت بھی حضرت شعیب علیہ السلام کو حاصل ہوئی نہ کہ ان کی بیٹی کو تو اس آیت مبارکہ میں خدمت کے عوض نکاح کرنے پر دلیل نہیں، قرآن پاک میں ہے۔ "اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ" تم انہیں اپنے مالوں کے ذریعے نکاح کرنے کو تلاش کرو نہ کہ زنا کے لئے (۲)

فتاوی ہندیہ میں ہے" المهر إنما يصح بكل ما هو مال متقوم" کہ مہر کے صحیح ہونے کے لئے مال متقوم ہونا ضروری ہے۔(۳)

فتاوی شامی میں ہے کہ

"ومقتضاه وجوب مهر المثل في خدمة وليها وعدم لزوم الخدمة، وكذا في مثل قصة شعيب عليه السلام۔۔۔۔ فإنه زوج موسى عليهما السلام بنته على أن يرعى له غنمه ثماني

---

(۱) فتاوی شامی: ۴/ ۲۲۰

(۲) سورۃ النساء آیت: ۲۴

(۳) فتاوی ھندیہ: ۱/ ۳۰۲، دار الفکر بیروت

سنين، وقد قصه الله تعالى علينا بلا إنكار، فكان شرعا لنا وقد استدل بهذه القصة على ترجيح ما مر من رواية الجواز في رعي غنمها ورده في الفتح بأنه إنما يلزم لو كانت الغنم ملك البنت دون شعيب، وهو منتف"(۱)

ترجمہ۔اس کا مقتضیٰ (جب غیر مال کو مہر بنایا گیا ہو) تو مہر مثل واجب ہوگا خدمت لازم نہیں ہوگی اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں ہے اس لیے کہ جب حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آٹھ سال بکریاں چرانے پر اپنی بیٹی کا نکاح کیا تو اس واقعہ کو اللہ عز وجل نے بغیر رد کے بیان فرمایا یہ ہماری شریعت میں بھی مشروع ہوگا بعض نے اس واقعہ کے ذریعہ سے مہر کے طور پر بکریاں چرانے کے جواز کا استدلال کیا ہے؛ لیکن فتح القدیر میں اس بات کو رد کیا گیا ہے کہ یہ مہر کے طور پر بکریاں چرانا اس وقت جائز ہے کہ جب وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کی ملکیت میں ہوتیں جبکہ بکریاں ان کی بیٹی کی ملکیت میں نہیں تھیں۔

خلاصۃ الفتاوی میں ہے: وہ عقد کہ اس میں کوئی شرط خواہ جائز ہو یا فاسد موثر نہ ہو، جیسے نکاح۔

"وعقد لايتعلق بالجائز من الشرط والفاسد من الشرط لايبطله كالنكاح"(۲)

لہذا شعیبؑ کے نکاح کے جواز میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، نیز حضرت موسی کی خدمت میں بھی اختلاف نہیں ہے، البتہ ملازمت کو مہر بنانے کے مطلب میں اختلاف ہے؛ لیکن تعلیمِ اجرت میں کسی اختلاف باقی نہ رہا۔

---

(۱) رد المحتار: ۴/۲۳۰، دار المعرفہ بیروت

(۲) خلاصۃ الفتاوی: ۲/۳۴۹، فصل: ۵، مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ

عقدِ نکاح میں تعلیم قرآن کو بطور حق مہر مقرر کرنے کا حکم؟

تعلیمِ قرآن کو حق مہر شمار کرنا ایک اختلافی مسئلہ ہے، ائمہ احناف اسے حق مہر قرار دینے کے خلاف ہیں جبکہ آئمہ ثلاثہ کے ہاں تعلیمِ قرآن کو حق مہر شمار کرنا بالاتفاق جائز ہے، اس اجمال کی تفصیل میں جانے سے قبل ان حکمتوں کو جان لینا چاہیے جن کے پیشِ نظر شرع متین نے حق مہر کو واجب قرار دیا ہے۔

مہر کی رسم اسلام سے پہلے مختلف صورتوں میں رائج تھی، اسلام نے اس میں اصلاحات کرتے ہوئے اس شائستہ رسم کو برقرار رکھا، عقدِ نکاح میں حق مہر کی ادائیگی عورت کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کرتی ہے اس میں عورت کی معاشی کفالت کا حصہ بھی ہے اور اس سے رشتہ ازدواج کی پائیداری اور استحکام بھی پیشِ نظر ہے، حق مہر کی حکمتوں اور مصلحتوں کو بیان کرتے ہوئے بدائع الصنائع میں شمس العلماء علامہ علاء الدین کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"فَلَوْ لَمْ يَجِبْ الْمَهْرُ بِنَفْسِ الْعَقْدِ لَا يُبَالِي الزَّوْجُ عَنْ إِزَالَةِ هَذَا الْمِلْكِ بِأَدْنَى خُشُونَةٍ تَحْدُثُ بَيْنَهُمَا، لِأَنَّهُ لَا يَشُقُّ عَلَيْهِ إِزَالَتُهُ لَمَّا لَمْ يَخَفْ لُزُومَ الْمَهْرِ فَلَا تَحْصُلُ الْمَقَاصِدُ الْمَطْلُوبَةُ مِنْ النِّكَاحِ؛ وَلِأَنَّ مَصَالِحَ النِّكَاحِ وَمَقَاصِدَهُ لَا تَحْصُلُ إِلَّا بِالْمُوَافَقَةِ وَلَا تَحْصُلُ الْمُوَافَقَةُ إِلَّا إِذَا كَانَتْ الْمَرْأَةُ عَزِيزَةً مُكَرَّمَةً عِنْدَ الزَّوْجِ وَلَا عِزَّةَ إِلَّا بِانْسِدَادِ طَرِيقِ الْوُصُولِ إِلَيْهَا إِلَّا بِمَالٍ لَهُ خَطَرٌ عِنْدَهُ، لِأَنَّ مَا ضَاقَ طَرِيقُ إِصَابَتِهِ يَعِزُّ فِي الْأَعْيُنِ فَيَعِزُّ بِهِ إِمْسَاكُهُ, وَمَا يَتَيَسَّرُ طَرِيقُ إِصَابَتِهِ يَهُونُ فِي الْأَعْيُنِ فَيَهُونُ إِمْسَاكُهُ وَمَتَى هَانَتْ فِي أَعْيُنِ الزَّوْجِ تَلْحَقُهَا

الْوَحْشَةُ فَلَا تَقَعُ الْمُوَافَقَةُ فَلَا تَحْصُلُ مَقَاصِدُ النِّكَاحِ''(۱)

اگر عقدِ نکاح میں شوہر پر مہر لازم نہ ہوتو وہ معمولی ناچاقی پیدا ہونے پر بھی نکاح ختم کر دے گا کیونکہ جب مہر اس پر لازم نہیں تو نکاح کا ختم کرنا اسے گراں بھی نہیں گزرے گا، یوں نکاح سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوں گے۔ مزید یہ کہ نکاح کے مقاصد اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں، جب زوجین میں موافقت ہو اور موافقت اسی وقت ہوسکتی ہے کہ جب شوہر کی نظر میں بیوی کی عظمت ہو اور شوہر کی نظر میں اسی وقت بیوی کی عظمت پیدا ہوسکتی ہے جب اس پر کوئی ایسی چیز لازم کر دی جائے جو اس کی نظر میں قیمتی اور قابل قدر ہو کیونکہ جس چیز کا حصول مشکل ہو اس کی دل میں قدر ہوتی ہے، انسان اسے عزیز رکھتا ہے اور جو چیز بآسانی ہاتھ آجاتی ہے وہ انسان کی نظر میں حقیر ہوتی ہے۔ اس لیے اگر عورت کی اہمیت اور وقعت شوہر کی نظر میں نہ ہوتو دونوں میں موافقت نہ ہوگی، نتیجے میں نکاح کے مقاصد حاصل نہیں ہوں گے۔

اس سلسلے میں شارح ''حجۃ اللہ البالغۃ'' سعید احمد پالن پوری لکھتے ہیں:

مہر سے نکاح پائیدار ہوتا ہے، نکاح کا مقصد اس وقت تکمیل پذیر ہوتا ہے جب میاں بیوی خود کو دائمی رفاقت و معاونت کا خوگر بنائیں اور یہ بات عورت کی طرف سے تو اس طرح متحقق ہوتی ہے کہ نکاح کے بعد زمام اختیار اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے، وہ مرد کی پابند ہو جاتی ہے؛ مگر مرد بااختیار رہتا ہے، وہ طلاق دے سکتا ہے۔ پس مرد کو دائمی نکاح کا خوگر بنانے کی راہ یہی ہے کہ اس پر مہر واجب کیا جائے، تاکہ جب وہ طلاق دینے کا ارادہ کرے تو مالی نقصان اس کی نگاہوں کے سامنے رہے اور وہ ناگزیر حالات ہی میں طلاق دے۔ پس حق مہر نکاح کو پائیدار بنانے کا سبب ہے۔ دوسری مصلحت یہ ہے کہ حق مہر سے نکاح کی عظمت ظاہر ہوتی ہے، نکاح کی عظمت و اہمیت بغیر مال کے

(۱) کاسانی، بدائع الصنائع: ۲/ ۲۷۵، بیروت: دار الکتاب العربی

جو کہ عورت کا بدل ہوتا ہے، ظاہر نہیں ہوتی، کیونکہ لوگوں کو جس قدر مال کی حرص ہے اور کسی چیز کی نہیں۔ پس مال خرچ کرنے سے نکاح کا مہتم بالشان ہونا ظاہر ہوتا ہے۔(۱)

درج بالا دونوں اقتباسات میں حق مہر کے وجوب کے جو مصالح بیان کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل نکات کی صورت میں سامنے آتا ہے:

۱۔مہر عقد نکاح کی وُقعت و اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

۲۔عورت کے شرف کو ثابت کرتا ہے اور اس کی قدر و منزلت میں اضافہ کرتا ہے۔

۳۔عائلی زندگی میں مالی ضروریات کی فراہمی مرد کے ذمہ ہے جس کا علامتی اظہار مرد حق مہر کی ادائیگی سے کرتا ہے۔

۴۔ازدواجی زندگی کے حسن انتظام کا پیش خیمہ ہے اور باہمی الفت و محبت کے ماحول کو فروغ دیتا ہے۔

۵۔گھریلو معاشرت کو بطریق احسن نمٹانے میں مرد کے حسن نیت پر دلالت کرتا ہے اور اسے پابند کرتا ہے کہ عورت کے جملہ حقوق کا ضامن بنے۔

۶۔نکاح جیسے مقدس رشتے کو دوام بخشنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

روایت کردہ واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے نکاح کے خواہش مند مرد سے اولاً کسی ایسی شے کی ملکیت سے متعلق دریافت فرمایا جو مال ہو یا مال کے مثل ہو، جب اس نے اپنی مفلسی ظاہر کی اور سوائے جسم پر لپیٹی ایک چادر کے اس کے پاس کچھ نہ پایا تو اس کے عقدِ نکاح کے لیے تعلیمِ قرآن کو حق مہر شمار کر لیا، یہ عمومی حالت نہیں بلکہ شارع علیہ السلام نے مخصوص حالات میں مخصوص فرد کے لیے خصوصی حکم مرحمت فرمایا ہے، دورِ حاضر میں بھی اگر کوئی شخص مفلس و نادار ہے اور مال یا مثل مال میں سے

(۱) مفتی سعید أحمد صاحب، رحمۃ اللہ الواسعۃ: ۵/ ۶۸، کراتشی، الباکستان: زمزم ببلشرز

اس کی ملکیت میں ایسی کوئی شے نہیں جسے عقدِ نکاح میں حق مہر شمار کیا جاسکے تو اپنی منکوحہ کو تعلیمِ قرآن کے عوض نکاح پر راضی کرسکتا ہے، اگر اس کی منکوحہ تعلیمِ قرآن کے عوض عقدِ نکاح کے لیے راضی ہوجائے تو نکاح منعقد ہوجائے گا۔

جب متاخرین ائمہ نے عبادات، اذان، امامت وخطابت، وعظ ونصیحت اور تعلیمِ قرآن کا معاوضہ لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی، دورِ حاضر میں علوم کے شعبہ جات بن چکے ہیں، تعلیمِ قرآن ایک باقاعدہ شعبہ ہے جس کی تعلم کے لیے صَرف ہونے والے وقت کا معاوضہ نہ صرف لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا بلکہ پہلے سے طے بھی کرلیا جاتا ہے، حفاظ اور قراء حضرات قرآنِ مجید کی تعلیم مدارس میں دے رہے ہوں یا گھروں میں جا کر پڑھا رہے ہوں، اس کا معاوضہ لینے میں کوئی ممانعت نہیں، ان حالات اور اسباب کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلیمِ قرآن کو حق مہر مقرر کیا جاسکتا ہے، اگر کوئی عورت تعلیمِ قرآن کے عوض عقدِ نکاح کے لیے رضامند ہو تو نکاح منعقد ہوجائے گا، تاہم لازمی امر یہ ہے کہ اُن حکمتوں اور مصالح کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے جو حق مہر کے وجوب کا سبب ہیں تا کہ عقدِ نکاح کی اہمیت اور عورت کی عزت و وقار بھی ملحوظ رہے۔(۱) لہٰذا اگر حفظِ قرآن کو بطورِ مہر مقرر کرکے نکاح کیا گیا تو نکاح منعقد ہوجائے گا، اور شوہر کے ذمے مہرِ مثل ادا کرنا لازم ہوگا، یعنی لڑکی کے خاندان میں اس طرح کی لڑکی کا جو مہر متعارف ہے، وہ ادا کرنا ہوگا۔

دینی امور پر اجرت کی تیسری دلیل اذان کی اُجرت کا جواز

صحابیِ رسول، سیدنا ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: میں ایک قافلے کے ساتھ سفر پر نکلا، ہم حُنَین کے ایک راستے پر تھے، جہاں سے رسول اللہ ﷺ حُنَین سے واپسی پر گزر رہے تھے، اسی راستے میں رسولِ اکرم ﷺ ہم سے ملے، آپ کے مؤذن نے ادھر نماز کے لیے اذان کہی، ہم نے مؤذن کی آواز سنی تو اِس سے مُتَنَفِّر تھے، ہم مذاق

(۱) فتوی از: مفتی محمد شبیر قادری صاحب

میں اس کو دوہرانے لگے، رسول اللہ ﷺ نے یہ آواز سنی تو ہمیں بلا بھیجا، یہاں تک کہ ہم آپ ﷺ کے سامنے کھڑے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کس کی آواز میں نے سب سے بلند سنی ہے؟ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا اور انہوں نے سچ ہی کہا تھا، آپ ﷺ نے سب کو واپس بھیج دیا؛ لیکن مجھے روک لیا اور فرمایا: اُٹھ کر نماز کے لیے اذان کہو، میں کھڑا ہوا تو آپ ﷺ نے خود مجھے اذان کے کلمات پڑھائے، جب میں اذان مکمل کر چکا تو آپ ﷺ نے مجھے بلا کر ایک گٹھڑی عنایت فرمائی، جس میں کچھ چاندی تھی، میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! حکم فرمائیے کہ میں مکہ میں اذان کہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میری طرف سے اجازت ہے، میں مکہ مکرمہ رسول اللہ ﷺ کے گورنر سیدنا عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور رسول اللہ ﷺ کے حکم مبارک سے اُن کے ساتھ نماز کی اذان کہی۔

"خَرَجْتُ فِي نَفَرٍ، فَكُنَّا بِبَعْضِ طَرِيقِ حُنَيْنٍ؛ مَقْفَلِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ حُنَيْنٍ، فَلَقِيَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي بَعْضِ الطَّرِيقِ، فَأَذَّنَ مُؤَذِّنُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بِالصَّلَاةِ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، فَسَمِعْنَا صَوْتَ الْمُؤَذِّنِ وَنَحْنُ عَنْهُ مُتَنَكِّبُونَ، فَظَلِلْنَا نَحْكِيهِ وَنَهْزَأُ بِهِ، فَسَمِعَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الصَّوْتَ، فَأَرْسَلَ إِلَيْنَا حَتّٰى وَقَفْنَا بَيْنَ يَدَيْهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: 'أَيُّكُمُ الَّذِي سَمِعْتُ صَوْتَهُ قَدِ ارْتَفَعَ؟'، فَأَشَارَ الْقَوْمُ إِلَيَّ وَصَدَقُوا، فَأَرْسَلَهُمْ كُلَّهُمْ وَحَبَسَنِي، فَقَالَ: 'قُمْ، فَأَذِّنْ بِالصَّلَاةِ'، فَقُمْتُ، فَأَلْقٰى عَلَيَّ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ التَّأْذِينَ هُوَ بِنَفْسِهِ، ---، ثُمَّ دَعَانِي حِينَ قَضَيْتُ التَّأْذِينَ، فَأَعْطَانِي صُرَّةً فِيهَا شَيْءٌ مِنْ فِضَّةٍ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، مُرْنِي بِالتَّأْذِينِ بِمَكَّةَ، فَقَالَ: 'أَمَرْتُكَ بِهِ'، فَقَدِمْتُ

عَلٰی عَتَّابِ بْنِ أَسِيدٍ، عَامِلِ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ بِمَكَّةَ، فَأَذَّنْتُ مَعَهٗ بِالصَّلَاةِ عَنْ أَمْرِ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ''۔(۱)

اس حدیث میں اذان کہنے پر رسول اللہ ﷺ کی جانب سے چاندی دینے کا ذکر ہے، چنانچہ امام، ابو بکر، احمد بن حسین، بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو مؤذن کی اُجرت کے جواز کی دلیل بنایا ہے۔(۲) یہاں پر نہ تالیف قلب تھا اور نہ ابتدائے اسلام ہونے کی وجہ سے اجرت دی گئی ہے، لہٰذا مذکورہ صریح دلیل کی روشنی میں اذان کی اُجرت کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہنا چاہیئے۔

اذاں پر اجرت نہ لینے کی حدیث کا مطلب

یاد رہے کہ بغیر اُجرت مؤذن مقرر کرنے والی جس حدیث سے بعض لوگوں نے دینی اُمور پر اُجرت کے ناجائز و حرام ہونے کا استدلال کیا ہے جبکہ اسلاف امت وفقہاے اسلام نے اسے کراہت پر محمول کیا ہے، حرمت پر نہیں؛ کیوں کہ اس میں حرمت والا کوئی اشارہ بھی نہیں، چنانچہ سیدنا عثمان بن ابو عاص ثقفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! مجھے میری قوم کا امام بنا دیجیے، آپ ﷺ نے فرمایا: آپ اُن کے امام ہیں، ان کے کمزوروں کا خیال رکھیے اور ایسا مؤذّن مقرر کیجیے جو اپنی اذان پر اُجرت نہ لے۔

''قُلْتُ :يَا رَسُولَ اللّٰہِ، اجْعَلْنِي إِمَامَ قَوْمِي، قَالَ :'أَنْتَ إِمَامُهُمْ، وَاقْتَدِ بِأَضْعَفِهِمْ، وَاتَّخِذْ مُؤَذِّنًا لَّا يَأْخُذُ عَلٰى أَذَانِهِ أَجْرًا''۔(۳)

---

(۱) مسند إمام أحمد: ۹۸/۲۴، مؤسّسة الرسالة، بيروت، ۲۰۰۱ء؛ سنن النسائی، کتاب الأذان، باب کيف الأذان، حديث: ۶۳۲، واللّفظ لہٗ؛ سنن ابن ماجہ، کتاب الأذان والسّنة فيہ، حديث: ۷۰۸، سندہٗ حسنٌ

(۲) السنن الکبریٰ: ۱/۶۳۱، دار الکتب العلمیّة، بیروت، ۲۰۰۳ء

(۳) سنن أبي داوٗد، كتاب الصلاة، باب أخذ الأجر على التأذين، حديث ۵۳۱؛ سنن النسائي، كتاب الأذان، باب اتّخاذ المؤذن الذي لا يأخذ علٰى أذانه أجرا، حديث ۶۷۲، وسندهٗ صحيحٌ

اس حدیث سے اذان اور دیگر دینی اُمور پر اُجرت کی حرمت قطعاً ثابت نہیں ہوتی، رسولِ اکرم ﷺ کا یہ فرمانا کہ ایسا مؤذّن مقرر کیجیے، جو اذان پر اُجرت نہ لے، واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ اذان پر اُجرت لینے والے لوگ اس دَور میں موجود تھے، لیکن آپ ﷺ نے اُن کو کوئی وعید نہیں سنائی، اگر اذان پر اُجرت ناجائز وحرام ہوتی تو آپ ﷺ اس حوالے سے صریح ہدایت فرماتے، کیوں کہ حرام کی قباحت وشناعت اتنی ہے کہ اس حوالے سے مبہم بات نہیں کی جاسکتی۔

نیز اُس زمانہ میں بیت المال سے مؤذنین کے لئے وظیفہ جاری رہتا تھا، وظیفہ ملنے کے بعد مستقل تنخواہ کیوں دی جاتی، جبکہ موجودہ دور میں وظائف کا کوئی نظام نہیں ہے، اکثر اہل علم نے اس حدیث کو کراہت پر محمول کیا ہے اور اُجرت نہ لینے کو بہتر قرار دیا ہے، لینے کو حرام نہیں کہا۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا قول

محدث شہیر، امام، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، ترمذیؒ (متوفی، ۲۷۹ھ) اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اس حدیث پر اہل علم کے ہاں عمل کیا جاتا ہے، اہل علم یہ ناپسند کرتے ہیں کہ مؤذّن اذان پر اُجرت لے، وہ مؤذّن کے لیے یہ مستحب سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی اذان میں صرف نیکی کا ارادہ رکھے۔

"وَالْعَمَلُ عَلٰى هذَا عِنْدَ أَهلِ الْعِلْمِ؛ كَرِهُوا أَنْ يَّأْخُذَ الْمُؤَذِّنُ عَلَى الْأَذَانِ أَجْرًا، وَاسْتَحَبُّوا لِلْمُؤَذِّنِ أَنْ يَحْتَسِبَ فِي أَذَانِه"۔(۱)

علامہ مقدسیؒ کا قول

علامہ، عبداللہ بن احمد، ابن قدامہ، مقدسیؒ (متوفی، ۶۲۰ھ) اذان پر اُجرت کے

(۱) سنن الترمذی، أبواب الصلاۃ، باب ماجاء فی کراہیۃ أن، أخذ المؤذن علی الأذان أجرا

ناپسندیدہ ہونے کے حوالے سے بعض اہل علم کے اقوال ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:
چونکہ یہ معلوم عمل ہے، لہٰذا اس پر اُجرت لینا جائز ہے، جیسے دیگر تمام اعمال پر اُجرت جائز ہے، ہم نہیں جانتے کہ اذان پر اُجرت کے جائز ہونے میں کسی نے کوئی اختلاف کیا ہو۔

"لِأَنَّهٗ عَمَلٌ مَّعْلُومٌ، يَجُوزُ أَخْذُ الرِّزْقِ عَلَيْهِ، فَجَازَ أَخْذُ الْأُجْرَةِ عَلَيْهِ، كَسَائِرِ الْأَعْمَالِ، وَلَا نَعْلَمُ خِلَافًا فِي جَوَازِ أَخْذِ الرِّزْقِ عَلَيْهِ"۔(۱)

علامہ طیبیؒ کا قول

معروف شارحِ حدیث، علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: ایک قول کے مطابق اس حدیث سے ان لوگوں نے دلیل لی ہے، جو اذان پر اُجرت کو ممنوع قرار دیتے ہیں؛ لیکن اس میں ایسی کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ عین ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم صرف افضلیت کو اختیار کرتے ہوئے دیا ہو۔

"قِيلَ: تَمَسَّكَ بِهٖ مَنْ مَّنَعَ الِاسْتِئْجَارَ عَلَى الْأَذَانِ، وَلَا دَلِيلَ فِيهِ، لِجَوَازِ أَنَّهٗ ﷺ أَمَرَهٗ بِذٰلِكَ أَخْذًا بِالْأَفْضَلِ"۔(۲)

علامہ محمد عبد الرحمن محدث، مبارک پوری رحمہ اللہ کا قول

علامہ ابو بکر محمد بن عبد اللہ، ابن العربیؒ (متوفی، ۵۴۳ھ) سے نقل کرتے ہوئے علامہ محمد عبد الرحمن محدث، مبارک پوری رحمہ اللہ (م ۱۳۵۳ھ) لکھتے ہیں:

---

(۱) المغنی: ۱/۳۰۱، مکتبۃ القاہرۃ: ۱۹۶۸

(۲) شرح الطيبي على مشكاة المصابيح، المعروف بـالكاشف عن حقائق السنن ۳:۹۱۸/، مكتبة نزار مصطفى الباز، الرياض، ۱۹۹۷ء

اذان، نماز، قضا سمیت دینی اُمور پر اُجرت کا جائز ہونا ہی صحیح (راجح) ہے۔

"اَلصَّحِيحُ جَوَازُ أَخْذِ الْأُجْرَةِ عَلَى الْأَذَانِ، وَالصَّلَاةِ، وَالْقَضَاءِ، وَجَمِيعِ الْأَعْمَالِ الدِّينِيَّةِ"۔(۱)

علامہ، ابو الحسن، عبید اللہ بن محمد، مبارک پوری رحمہ اللہ کا قول

علامہ، ابو الحسن، عبید اللہ بن محمد، مبارک پوریؒ (متوفی ، ۱۴۱۴ھ) فرماتے ہیں: بعض لوگوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اذان کی اُجرت حرام ہے، لیکن یہ بات مخفی نہیں کہ یہ حدیث اذان کی اُجرت کے حرام ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔

"وَاسْتَدَلَّ بَعْضُهُمْ عَلَى التَّحْرِيمِ بِهٰذَا الْحَدِيثِ، وَلَا يَخْفٰى أَنَّهُ لَا يَدُلُّ عَلَى التَّحْرِيمِ"۔(۲)

کراہت پر محمول کرنے کی دلیل

اکثر علمائے امت کا اس حدیث کو حرمت کی بجائے کراہت پر محمول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اذان پر لی جانے والی اُجرت حرام نہیں، بلکہ اس میں زیادہ سے زیادہ کراہت ہے اور محض کراہت جواز ہی کی دلیل ہوتی ہے، چنانچہ سینگی لگانے کی اُجرت کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: سینگی لگانے والے شخص کی کمائی خبیث (مکروہ) ہے۔

"وَكَسْبُ الحجّام خَبِيثٌ۔"(۳)

لیکن خود آپ ﷺ سے سینگی کی اُجرت دینا بھی ثابت ہے۔

حُمَید تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سینگی لگانے

---

(۱) تحفة الأحوذي: ۱/ ۵۲۸، دار الكتب العلمية، بيروت

(۲) مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۲/ ۳۷۵، الجامعة السلفية، بنارس ۱۹۸۴ء

(۳) صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم ثمن الكلب، حديث: ۱۵۶۸

والے شخص کی کمائی کے بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے سینگی لگوائی، آپ ﷺ کو ایک غلام ابوطیبہ نے سینگی لگائی تھی، آپ ﷺ نے اسے دو صاع غلہ دینے کا حکم فرمایا، نیز اس کے مالکوں سے بات کی تو انہوں نے اس کے خراج (طلب کی جانے والی کمائی) میں کمی کر دی، آپ ﷺ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ تم علاج کے جتنے بھی طریقے اختیار کرتے ہو، ان میں سب سے بہترین سینگی لگانا ہے۔

"سُئِلَ أَنَس بْنُ مَالِكٍ عَنْ كَسْبِ الْحَجَّامِ، فَقَالَ :احْتَجَمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، حَجَمَهُ أَبُو طَيْبَةَ، فَأَمَرَ لَهُ بِصَاعَيْنِ مِنْ طَعَامٍ، وَكَلَّمَ أَهْلَهُ، فَوَضَعُوا عَنْهُ مِنْ خَرَاجِهِ، وَقَالَ :'إِنَّ أَفْضَلَ مَا تَدَاوَيْتُمْ بِهِ الْحِجَامَةُ"۔ (۱)

جب ایک اُجرت خبیث کہے جانے کے باوجود دوسرے دلائل کی بنا پر جائز ہو سکتی ہے تو جسے خبیث بھی نہیں کہا گیا، کسْبُ الْامام خَبِيثٌ، کسْبُ المدرسِ خَبِيثٌ، نہیں کہا گیا، تو دوسرے دلائل سے ان امور کی اجرت کیوں جائز نہیں ہوتی؟

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح سینگی لگانے کی اُجرت کے خبیث ہونے سے مراد ناجائز و حرام نہیں، بل کہ جائز مع الکراہت ہے، اسی طرح اذان کی اُجرت نہ لینے والے مؤذن کی تقرری سے مراد بھی جائز مع الکراہت ہی ہے، بل کہ اس کی کراہت سینگی کی اُجرت سے کم بھی ہے، کیوں کہ اس پر کوئی حکم نہیں لگایا گیا۔

دینی امور (نفسِ امامت) پر اجرت کے جواز کی چوتھی دلیل

بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو صرف مستقل امامت کروانے کی بناء پر اجرت دی گئی، ان میں سے ایک مثال عمر بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی ہے، کہ جنہیں امامت کی وجہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب حلّ أجرۃ الحجامۃ، حدیث :۱۵۷۷

سے سب سے پہلی جو چیز دی گئی وہ قمیص تھی ۔(۱) یہ تو مثال تھی امامت صغری کی' یعنی نمازوں کی امامت کی' اسکے علاوہ امامت کبری پر اجرت کی سوؤں مثالیں موجود ہیں؛ کیونکہ امامت کبری کے منصب پر فائز کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جس نے اس پر اجرت نہ لی۔ الا ماشاء اللہ۔

پانچویں دلیل کتابتِ مصاحف وخرید وفروخت پر قیاس

دورِ قدیم میں مصاحف کی نقول تیار کرنے کے لیے کتابت کروائی جاتی تھی، موجودہ دَور میں ایک دفعہ کتابت اور پھر طباعت کروائی جاتی ہے، اس میں بھی اُجرت دینی لینی پڑتی ہے، جب کہ نقول تیار ہونے کے بعد بھی خرید وفروخت کے مرحلے سے گزر کر ہی عوام الناس تک پہنچتی ہیں، اس اُجرت کے جواز پر صحیح بخاری و صحیح مسلم کی مذکورہ احادیث سے دلیل لیتے ہوئے معروف فقیہ ومحدث، حافظ، ابوسلیمان، حمد بن محمد، خطابیؒ (متوفی، ۳۸۸ھ) فرماتے ہیں: دَم پر بکریاں لینے والی حدیث میں یہ دلیل ہے کہ مصاحف کی خرید وفروخت اوران کی کتابت پر اُجرت لینا جائز ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بابرکت ناموں کو پڑھ کر دَم کرنا جائز ہے، نیز طبیب ومعالج کی اُجرت کا بھی جواز ہے، کیوں کہ قراءت، دَم اور پھونک جائز ہیں اور آپ ﷺ نے ان کاموں پر اُجرت کو جائز قرار دیا ہے، اسی طرح طبیب جو مشورے، (بیماری کی) تفصیلات اور علاج تجویز کرتے ہیں، وہ بھی فعل ہیں، اِس فعل اور اُن افعال میں کوئی فرق نہیں، جن پر رسولِ اکرم ﷺ نے اُجرت کو جائز قرار دیا۔

"وَفِي الْحَدِيثِ دَلِيلٌ عَلٰى جَوَازِ بَيْعِ الْمَصَاحِفِ وَأَخْذِ الْأُجْرَةِ عَلٰى كَتْبِهَا، وَفِيهِ إِبَاحَةُ الرُّقْيَةِ بِذِكْرِ اللّٰهِ فِي أَسْمَائِهِ، وَفِيهِ إِبَاحَةُ أَجْرِ الطَّبِيبِ وَالْمُعَالِجِ، وَذٰلِكَ أَنَّ الْقِرَائَةَ

(۱) صحیح البخاری، حدیث: ۴۳۰۲

وَالرُّقْيَةَ وَالنَّفَثَ فِعْلٌ مِنَ الْأَفْعَالِ الْمُبَاحَةِ, وَقَدْ أَبَاحَ لَهُ أَخْذَ الْأُجْرَةِ عَلَيْهَا, فَكَذٰلِكَ مَا يَفْعَلُهُ الطَّبِيبُ مِنْ قَوْلٍ وَوَصْفٍ وَعِلَاجٍ؛ فِعْلٌ, لَا فَرْقَ بَيْنَهُمَا"۔(۱)

دینی امور پر اُجرت کے جواز کی چھٹویں دلیل

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوہ میں مجاہد بن کر شریک ہونے سے زیادہ ثواب کا عمل کیا ہے؟ مگر کیا مجاہدین کو مالِ غنیمت نہیں دیا جاتا تھا؟ کیا مجاہدین کا مالِ غنیمت لینا جہاد کے ثواب کے خلاف ہے؟ ہرگز نہیں! تو امامت کے ساتھ تنخواہ کیوں ثواب کا ذریعہ وعبادت نہیں ہوسکتی؟ امامت کے ساتھ تنخواہ لینا ثواب کے خلاف کیسے ہوسکتا ہے؟

ساتویں دلیل عاملین کو اُجرت دینے پر قیاس

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں زکوۃ وصول کرنے کے لئے عامل ہوتا تھا، جو خالص دینی کام ہے، زکوۃ فرض ہے، اوراس کی فرض کی ادائیگی میں معاون عامل ہوتا ہے، جس طرح نماز فرض ہے اوراس فرض کی ادائیگی میں امام معاون ہوتا ہے؛ مگر اس عامل کو بھی تنخواہ دی جاتی تھی ،عاملینِ زکوۃ کو مشاہرہ دینا ثواب کے خلاف نہیں ہے۔ "العامل على الصدقة بالحق كالغازى فى سبيل الله حتى يرجع الى بيته" (۲) جب یہ جائز ہے تو امامت پر تنخواہ کیوں جائز نہیں؟

دینی امور پر تنخواہ اور خلفائے راشدین کا عمل، آٹھویں دلیل

معلمین و مدرسین کی تنخواہ پر شبہ کرنے والوں کو خلفائے راشدین کے عمل پر غور

---

(۱) معالم السنن: ۱۰۱/۱۰، المطبعۃ العلمیّۃ، حلب ۱۹۳۲ء

(۲) سنن أبي داؤد: ۵۹/۲

لینا چاہیئے کہ آج کے اِن نابلدوں کا نظریہ صحیح ہے یا حضرات خلفائے راشدین کا عمل، چنانچہ خلفاے راشدین نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں معلمین قرآن کے لیے وظائف اور تنخواہیں مقرر فرما کر اس مسئلے کو بے غبار کر دیا ہے۔(دیکھیے کتاب الخراج لابی یوسف:۱۸۷) اور خلفاے راشدین کا یہ فعل ہمارے لیے حجت ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: تم میری سنت کو لازم پکڑو اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفاے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو، اسے ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑے رہو اور دین میں نئی باتیں ایجاد کرنے سے بچو کیوں کہ دین میں پیدا کی گئی ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔(۱)

مدرسین کی تنخواہیں اور حضرت عمرؓ کا عمل

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں معلمین کی تنخواہیں مقرر کی تھیں، کنز العمال میں روایت موجود ہے۔

"ثلاثة كانوابالمدينة يعلمون الصبيان وكان عمربن الخطاب يرزق كل واحد منهم خمسة عشر درهما كل شهر"۔(۲)

اسی طرح قرآن اور دینی علوم کی تعلیم پر دوسرے افراد کے لئے حضرت عمر نے جو وظائف مقرر کئے تھے ان کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ"ثم فرض للناس على منازلهم وقراتهم القرآن" الخ، حضرت عمرؓ نے لوگوں کے مرتبے کے مطابق اور قرآن پڑھنے پر وظیفہ مقرر کیا۔(۳)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ملتا ہے کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ

(۱)ابو داؤد، حدیث:۴۶۰۷

(۲)کنز العمال، حدیث:۹۱۷۸

(۳)فتوح البلدان:۴۳۸

عنہ کی طرح مؤذنوں، اماموں اور معلموں کے وظائف مقرر کیئے۔(۱)

حضرت عمرؓ کا سالانہ پانچ ہزار درہم وظیفہ

☆۱۵ھ میں جب تمام لوگوں کے روز ینے مقرر ہوئے تو اور اکابرِ صحابہ کے ساتھ حضرت عمرؓ کے لیے بھی پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کیے گئے۔(۲)

حضرت عمرؓ کا فیصلہ

☆علامہ نووی ؒ نے خطیبؒ بغدادی کی بات نقل کرتے ہوئے اجرت کی مقدار ذکر کی ہے: امام پر یہ بات لازم ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو فقہ وفتاویٰ کے لیے فارغ کرے، اس کے لیے اتنی اجرت مقرر کرے جو اُسے دیگر پیشوں کے اختیار کرنے سے بے نیاز کردے، اور یہ بیت المال سے مقرر کرے، پھر حضرت عمرؓ کا معمول نقل کیا کہ جو شخص فتویٰ دینے کا اہل ہوا کرتا تھا، اسے سال بھر میں سو دینار حضرت عمرؓ عطا فرماتے تھے۔(۳)

☆حضرت عمرؓ کے پاس خرچ کے لیے باضابطہ ایک فہرست تھی، جس میں ان کے علم وفضل کا کیا جاتا تھا، اگر کوئی بدری صحابی ہوتو ان کا وظیفہ زیادہ ہوتا تھا، ان کے مقابلے میں جو بعد کے مسلمان ہیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے اہلِ بیت کے افراد کو زیادہ نفقہ عطا کیا تو صاحب زادہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اعتراض ہوا۔

☆جامع صغیر میں منقول ہے: کتاب اللہ کے حامل کو بیت المال سے ہر سال دوسو دینار دیے جائیں گے۔(۴)

---

(۱) سیرۃ العمرین، بحوالہ خیر القرون کی درسگاہیں: ۳۴۱

(۲) الفاروق ۲/ ۲۹۸

(۳) مقدمہ رسم المفتی: ۱۵

(۴) الجامع الصغیر ۱/ ۳۳۶، شاملہ

☆ علامہ مناویؒ نے اس حدیث کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اگر یہ مقدار اس کے خرچ کے لیے کافی ہو تو ورنہ اگر کم ہو جائے تو اس مقدار میں اضافہ کیا جائے گا۔(۱)

☆ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب لوگوں کو ایک دن کا نفقہ ملتا تھا تو اس کی مقدار یہ ہوتی کہ ہر آدمی کو نصف بکرا دیا جاتا، خدام دین کی ہمت افزائی کا سلسلہ تھا اور خدام دین کی اتنی رعایت کی جاتی کہ وہ مکمل توجہ کے ساتھ دینی خدمت میں مشغول ومصروف رہیں۔(۲)

☆ قراء صحابہ کو قرآن کی تعلیم کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دور دراز مقامات پر تعینات کیا، وہ جا کر ان کو قرآن پڑھاتے اور تفقہ فی الدین کے لیے تیاری کراتے، ان میں سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، ابو ایوب رضی اللہ عنہ، ابو الدرداء رضی اللہ عنہ، کا نام بالخصوص تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے امام ابن الجوزی نے تصریح کی ہے کہ باقاعدہ ان کی تنخواہیں مقرر کی گئی تھیں۔(۳)

عام لوگوں پر خرچ کرنے والے کیا اہلِ علم پر خرچ نہ کرتے تھے؟

جو لوگ تنخواہ کے جواز کے منکر ہیں وہ حضرت عمرؓ کے تنخواہ مقرر کرنے کے عمل کو تنخواہ نہیں شمار کرتے ہیں بلکہ عمومی کفالت وتعاون شمار کرتے ہیں، جس کے لئے مختلف واقعات کا سہارا لیتے ہیں، اُن واقعات کو پڑھنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھیں کہ جو عمرؓ عام لوگوں کا اتنا خیال رکھتے تھے کیا وہ علماء وحفاظ جو دینی خدمات میں مصروف ہیں ان سے غفلت برتیں گے؟ آخر عقل سے اتنی دشمنی کیوں ہے کہ حضرت عمرؓ کا تعاون نظر آرہا ہے مگر تنخواہ نظر نہیں آرہی ہے؟

---

(۱) تیسیر بشرح الجامع الصغیر ۱/۹۹۹، شاملہ

(۲) ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ 5، جلد 98: رجب 1435 ہجری مطابق مئی 2014ء

(۳) الفاروق: ۲/۱۳۸

ایک موقع پر عمرؓ نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے سلامت رکھا تو میں اہل عراق کی بیوہ عورتوں کو اتنا خوش حال کر دوں گا کہ میرے بعد وہ کسی کی محتاج نہ رہیں گی۔

"لَئِنْ سَلَّمَنِي اللّٰهُ، لَأَدَعَنَّ أَرَامِلَ أَهْلِ العِرَاقِ لاَ يَحْتَجْنَ إِلَى رَجُلٍ بَعْدِي أَبَدًا" (بخاری، کتاب اصحاب النبی ﷺ، بَابُ قِصَّةِ البَيْعَةِ، وَالِاتِّفَاقِ عَلَى عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَفِيهِ مَقْتَلُ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا)

دین کی خاطر مجاہدے والوں کے ساتھ حضرت عمرؓ کا حسنِ سلوک

عمرؓ کے زمانے میں بے انتہا فتوحات ہوئیں، کفار کے بے شمار علاقے فتح ہو کر اسلامی مملکت میں شامل ہوتے رہے اور ان سے حاصل ہونے والے مال غنیمت اور دوسری مدات کی آمدنی کے مسجد نبوی میں ڈھیر لگے رہتے تھے اور حضرت عمرؓ اس سارے مال کو ساری مملکت میں تقسیم کرنے پر پرعزم رہتے تھے، فرماتے ہیں: اگر دوسرے مسلمین کا خیال نہ ہوتا تو جو بستی میں فتح کرتا اس کو لوگوں میں تقسیم کر دیتا جیسا کہ نبی ﷺ نے خیبر کو تقسیم کر دیا تھا۔

"لَوْلَا آخِرُ الْمُسْلِمِينَ مَا فَتَحْتُ قَرْيَةً إِلَّا قَسَمْتُهَا بَيْنَ أَهْلِهَا كَمَا قَسَمَ النَّبِيُّ ﷺ خَيْبَرَ (۱)

خدمت بقدرِ مشقت

آپ نے اس مال غنیمت کی مملکت کے لوگوں میں تقسیم کے مختلف معیار مقرر کیے ہوئے تھے جس کا اندازہ ذیل کی روایات سے ہوتا ہے، بدری صحابہ کا (سالانہ) وظیفہ پانچ پانچ ہزار تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں انہیں (بدری صحابہ کو) ان صحابیوں پر فضیلت دوں گا جو ان کے بعد ایمان لائے۔

(۱) بخاری کتاب الجہاد والسیر باب الغنیمۃ

”كَانَ عَطَاءُ الْبَدْرِيِّينَ خَمْسَةَ آلَافٍ, خَمْسَةَ آلَافٍ، وَقَالَ عُمَرُ: لَأُفَضِّلَنَّهُمْ عَلَى مَنْ بَعْدَهُمْ“(۱)

ابن عمرؓ نے کہا آپ (عمرؓ) نے تمام مہاجرین اولین کا وظیفہ (اپنے عہد خلافت میں) چار چار ہزار چار چار قسطوں میں مقرر کر دیا تھا لیکن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا وظیفہ چار قسطوں میں ساڑھے تین ہزار تھا اس پر ان سے پوچھا گیا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی مہاجرین میں سے ہیں، پھر آپ انہیں چار ہزار سے کم کیوں دیتے ہیں؟ تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انہیں ان کے والدین ہجرت کر کے یہاں لائے تھے، اس لیے وہ ان مہاجرین کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے خود ہجرت کی تھی۔

”عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ﷛، قَالَ: كَانَ فَرَضَ لِلْمُهَاجِرِينَ الْأَوَّلِينَ أَرْبَعَةَ آلَافٍ فِي أَرْبَعَةٍ, وَفَرَضَ لِابْنِ عُمَرَ ثَلَاثَةَ آلَافٍ وَخَمْسَ مِائَةٍ، فَقِيلَ لَهُ: هُوَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ فَلِمَ نَقَصْتَهُ مِنْ أَرْبَعَةِ آلَافٍ، فَقَالَ: إِنَّمَا هَاجَرَ بِهِ أَبَوَاهُ، يَقُولُ: لَيْسَ هُوَ كَمَنْ هَاجَرَ بِنَفْسِهِ.(۲)

دودھ پیتے بچے کا وظیفہ مقرر کرنے والے عالم کا وظیفہ مقرر نہ کریں گے؟

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ چند تاجر دوست آئے اور معلی میں ٹھہرے، تو عمرؓ نے عبدالرحمن بن عوفؓ سے فرمایا کہ کیا خیال ہے؟ کیا آج رات ہم ان کو چوری سے بچانے کے لیے ان کی چوکیداری کریں؟ چنانچہ دونوں نے ان کی پہرے داری کرتے ہوئے رات گزاری اور صلوٰۃ ادا کرتے رہے جتنی اللہ نے ان کے نصیب میں لکھی تھی، اتنے میں عمرؓ نے ایک بچے کی رونے کی آواز سنی تو اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس کی ماں سے کہا کہ اللہ سے ڈر اور اپنے

(۱) فتح الباری شرح صحیح البخاری: ۷/۶۷۳

(۲) بخاری، کتاب المناقب الانصار، بَابُ هِجْرَةِ النَّبِيِّ ﷺ وَأَصْحَابِهِ إِلَى المَدِينَةِ

بچے کے ساتھ اچھا معاملہ کر یہ کہہ کر واپس آگئے، پھر بچے کے رونے کی آواز سنی، اس کی ماں کے پاس واپس آئے اور اس سے اسی طرح کہا، اور اپنی جگہ واپس آگئے، رات کے آخری پہر انھوں نے پھر بچے کی رونے کی آواز سنی تو اس کی ماں کے پاس واپس آئے اور فرمایا کہ تو برباد ہو، میرے خیال میں تو اچھی ماں نہیں ہے، بھلا کیا مسلہ ہے کہ رات بھر تیرا بچہ بے چین رہا ہے، وہ کہنے لگی کہ اے اللہ کے بندے! میں رات سے پریشان ہوں کیونکہ میں اس کا دودھ چھڑانا چاہتی ہوں اور یہ انکار کرتا ہے، عمرؓ نے نے دریافت فرمایا کیوں؟ کہنے لگی اس لیے کہ عمرؓ اسی بچے کے لیے وظیفہ مقرر کرتے ہیں جس کا دودھ چھڑایا جا چکا ہو، پھر پوچھا کہ اس کا کتنا ہوگا؟ عورت نے فرمایا کہ اتنا اتنا ماہوار۔ فرمایا تو برباد ہو جلدی مت کر، پھر فجر کی صلوٰۃ پڑھائی، اور اسی صلوٰۃ میں اتنا رو رہے تھے کہ لوگ ٹھیک سے آواز نہ سن پا رہے تھے، سو جب سلام پھیرا تو فرمایا کہ ہائے تمہارے عمر کی بربادی، مسلمین کے بچے قتل کردیے، پھر اعلان کرنے والے کو حکم دیا تو اس نے اعلان کیا کہ اپنے بچوں کو دودھ چھوڑانے میں جلدی نہ کرو ہم ہر نومولود مسلم بچے کے لیے وظیفہ مقرر کردیتے ہیں، اور یہ حکم تمام ممالک اسلامیہ میں پہنچادیا کہ مسلمین کے ہر پیدا ہونے والے بچے کا وظیفہ مقرر کیا جائے گا۔

"عن ابن عمر قال :قدمت رفقة من التجار، فنزلوا المصلى، فقال عمر لعبد الرحمن بن عوف :هل لك أن نحرسهم الليلة من السرق فباتا يحرسانهم، ويصليان ما كتب الله لهما فسمع عمر بكاء صبي فتوجه نحوه، فقال لأمه :اتقي الله وأحسني إلى صبيك، ثم عاد إلى مكانه فسمع بكاءه، فعاد إلى أمه، فقال لها :مثل ذلك، ثم عاد إلى مكانه، فلما كان في آخر الليل سمع بكاءه، فأتى أمه، فقال :ويحك إني لأراك أم سوء، مالي أرى ابنك لا يقر منذ الليلة قالت:يا عبد الله قد أبرمتني منذ

الليلة إني أريغه عن الفطام فيأبى، قال :ولم قالت :لأن عمر لا يفرض إلا للفطيم، قال :وكم له قالت :كذا وكذا شهرا، قال:ويحك لا تعجليه، فصلى الفجر وما يستبين الناس قراءته من غلبة البكاء فلما سلم قال:يا بؤسا لعمر كم قتل من أولاد المسلمين، ثم أمر مناديا فنادى ألا لا تعجلوا صبيانكم عن الفطام، فإنا نفرض لكل مولود في الإسلام وكتب بذلك إلى الآفاق:إنا۔(۱)

دینی امور پر تنخواہ کا جواز اور صحابہ کرام کا اجماع، نویں دلیل

حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے مذکورہ فیصلے سے ثابت ہوا کہ مؤذن اور امام کی تنخواہ مقرر لینا بھی جائز ہے، چونکہ ان کا یہ عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں رواج پا چکا تھا اور کسی صحابہ نے ان کے اس فیصلہ پر اعتراض بھی نہیں کیا، لہٰذا ثابت ہوا کہ اس پر صحابہ کا اجماع سکوتی ہو چکا ہے، جو تنخواہ تعین کرنے کے جواز کی قوی دلیل ہے، کیا صحابہ کرامؓ کے ان وظائف لینے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین سے دلیل جواز طلب کریں گے؟ بلا شبہ نہیں تھی، یا ان حضرات کے وظیفہ کو ناجائز کہہ دیں گے؟ بلا شبہ نہیں! پھر اس مسئلے میں صحابہ کرامؓ کے عمل کو دلیل بنا کر اگر آج وظائف لئے جاتے ہوں تو اسے ناجائز کہنا دیانت داری ہے؟ یا امت کو ایک نئے فتنے میں مبتلا کرنا ہے، اور بڑی مکاری اور سازش سے دشمن کا آلۂ کار بن کر عوام کو ائمہ سے بدظن کرنا ہے؟ خواہ کچھ بھی ہو ایسا کہنے یا لکھنے والے دین بیزاری کا پیدا کرنے کا جرم عظیم کر رہے ہیں۔

---

(۱) جامع الاحادیث، مسند العشرہ، مسند عمر بن الخطاب ، ابن سعد اور ابو عبید فی الاموال

دسویں دلیل صحابہ و تابعین کی متفقہ رائے

امام شعبہ بن حجاج رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: میں نے معاویہ بن قرہ تابعی رحمہ اللہ سے معلّم کی اُجرت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میں اس کے لیے اُجرت کو جائز سمجھتا ہوں، میں (شعبہ) نے حکم بن عُتَیبہ تابعی سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میں نے کسی بھی (صحابی یا تابعی) فقیہ کو اسے ناپسندیدہ کہتے نہیں سنا۔

"سَأَلْتُ مُعَاوِيَةَ عَنْ أَجْرِ الْمُعَلِّمِ، فَقَالَ: أَرَى لَهُ أَجْرًا، قَالَ شُعْبَةُ: وَسَأَلْتُ الْحَكَمَ، فَقَالَ: لَمْ أَسْمَعْ أَحَدًا يَكْرَهُهُ"۔(۱)

ابوقلابہ عبداللہ بن زید تابعی رحمہ اللہ کا فتوی

خالد حذا تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: میں نے ابوقلابہ عبداللہ بن زید تابعی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ ایک معلم تعلیم دے کر اُجرت لیتا ہے، تو (یہ ناجائز ہے؟) لیکن انہوں نے اس میں کوئی حرج خیال نہیں کیا۔

" سَأَلْتُ أَبَا قِلَابَةَ عَنِ الْمُعَلِّمِ يُعَلِّمُ، وَيَأْخُذُ أَجْرًا، فَلَمْ يَرَ بِهِ بَأْسًا"(۲)

امام طاؤس اور ابن سیرینؒ کا فتوی

☆ امام طاؤسؒ (تابعی) بھی اسے جائز سمجھتے تھے۔(۳)

☆ محمد بن سیرینؒ (تابعی) کے قول سے بھی اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔(۴)

(۱) مسند علی بن الجعد، حدیث: ۱۱۰۵، مؤسسۃ نادر، بیروت، سنۃ ۱۹۹۰ء، سندہٗ صحیحٌ

(۲) المصنّف فی الأحادیث والآثار، حدیث: ۲۰۸۳۱، مکتبۃ الرشد، الریاض سنۃ ۱۴۰۹ء، وسندہٗ صحیحٌ

(۳) ابن ابی شیبہ ایضاً، ح ۲۰۸۲۵ : وسندہ صحیح

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ ۶/۲۲۳ ح ۲۰۸۳۵ وسندہ صحیح

مذکورہ خلفاء راشدین کے بعد بھی بیت المال سے ائمہ، مؤذنین، و معلمین کو وظیفہ ملتا رہا، لیکن جب اسلامی حکومتوں میں استحکام نہیں رہا اور بیت المال کا نظام ختم ہو گیا وظائف بند ہو گئے تب تیسری صدی ہجری کے بعد حنفی فقہاء نے بھی اجرت کے جواز کا فتوی دیا جبکہ دیگر ائمہ تو پہلے سے اس کے جواز کے قائل تھے، جس کے بعد سے اس مسئلہ پر اتفاق ہو گیا ہے، لہٰذا اب اگر کوئی اس میں اختلاف کرے تو اس کے علم یا پھر عقل کا قصور ہے۔

تعمیر مساجد پر اجرت جائز ہو گی یا نہیں؟

مسجد کی تعمیر کو ہی دیکھ لیجیے کہ اینٹ، ریت، بجری، سریا وغیرہ سمیت عمارت کے لیے جو بھی لوازمات ہوتے ہیں، وہ سب کے سب اُجرت کے بغیر نہ بن سکتے ہیں، نہ کسی جگہ پہنچ سکتے ہیں، یہ لوگ اِس ''دوکان داری'' میں کیوں شریک ہوتے ہیں؟

☆ مسجد کی تعمیر بھی عبادت ہے، مگر معمار، زمین فروخت کرنے والا، الیکٹریشن، کلر کرنے والا، مینار لگانے والا، سب پیسہ لیتے ہیں، یہاں کوئی انہیں الزام نہیں دیتا کہ دنیا کما رہے ہیں۔

حج وعمرہ لے جانے کی اجرت لینا جائز یا ناجائز؟

☆ حج وعمرہ پر جانا عظیم عبادت ہے، مگر حج کمیٹی یا ٹراویلس چلانے والے مفت میں نہیں لے جاتے، حالانکہ وہ بھی ایک فریضہ ادا کروانے میں ہی اجرت وصول کی جا رہی ہے، وہاں کوئی فری کا مطالبہ نہیں کرتا۔

تبلغی اجتماع کے انتظامات پر اجرت لینا جائز یا جائز؟

☆ تبلیغی اجتماع کرنا ثواب کا کام ہے، وہاں کھانے کے چاول، پینڈال، مائک ، اسٹیج، سفر کے ٹکٹ وغیرہ سب کام پیسہ سے حاصل کئے جاتے ہیں کوئی نہیں کہتا ہے

سارے انتظامات مفت میں ہوں ، مستقل اجتماعات کے لئے خاموشی سے بغیر رسید وحساب کے لاکھوں کا چندہ وصول کیا جاتا ہے،کوئی اسے منع نہیں کرتا ،ایک کام پر اجرت لینا گناہ ہے تو یہ سارے کام کرنے والے بھی گناہ کر رہے ہیں ،اگر نہیں !(اور واقعتاً ان میں کوئی گناہ نہیں کر رہا ہے) تو ائمہ کرام کا مشاہرہ لینا بھی گناہ نہیں ہے۔

قرآن مجید فروخت کرنا کیا دین فروشی ہے؟

☆ قرآن مجید پرنٹ کرنا عبادت ہے،مگر مارکٹ میں قرآن قیمت سے ملتا ہے کوئی نہیں کہتا کہ ''قرآن بیچ کر پیسہ کما رہے ہیں ،کیسے بے شرم لوگ ہیں''؟

دینی اُمور پر اُجرت سے منع کرنے والے احباب مصاحف خرید کر نہیں لاتے؟ اگر وہ کہیں کہ کسی نے مسجد کے لیے مصاحف وقف کیے ہیں تو بھی وہ خرید کر ہی لاتا ہے، نیز ان کی کتابت وطباعت کے تمام مراحل پر اُجرت ادا کی گئی ہوتی ہے، وہ اپنے نزدیک اس حرام کاروبار میں تعاون کیوں کرتے ہیں؟ اور تو اور دینی اُمور پر اُجرت کو حرام قرار دینے پر مبنی ان کا اپنا تحریری مواد ایک ''دینی امر'' پر اُجرت دے کر ہی کتابت وطباعت کے مراحل سے گزرتا ہے۔کیا کبھی اُنہیں ''دین فروشی'' کا حصہ بننے پر ذرا بھی شرمندگی ہوئی ؟ پھر تو نورانی قاعدہ سے بخاری تک ،فضائل اعمال سے بہشتی زیور تک کی خرید وفروخت حرام ہو جائے گی۔

حضرت حسن بصریؒ اور امام شعبیؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ تو کاغذ اور محنت کی خریدی ہے، یعنی قرآن فروشی نہیں ہے۔

''إِنَّمَا يُشْتَرَى وَرَقُهُ وَعَمَلُهُ ,وَقَالَهُ خَالِدٌ, عَنِ الْحَسَنِ''(۱)

حضرت جابر بن زید نے اسے پاک کمائی اور عمدہ محنت قرار دیا ہے یعنی ہم خرما وہم ثواب۔

(۱) فتح الباری شرح صحیح البخاری: ۴/۳۵۵

''عَنْ مَالِكِ بْنِ دِينَارٍ قَالَ :دَخَلَ عَلَيَّ جَابِرُ بْنُ زَيْدٍ وَأَنَا أَكْتُبُ، مُصْحَفًا فَقَالَ: نِعْمَ الْعَمَلُ عَمَلُك، هَذَا الْكَسْبُ الطَّيِّبُ تَنْقِلُ كِتَابَ اللهِ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَى وَرَقَةٍ، قَالَ مَالِكٌ: وَسَأَلْتُ عَنْهُ الْحَسَنَ، وَالشَّعْبِيَّ فَلَمْ يَرَيَا بِهِ بَأْسًا''(۱)

ایک نصرانی نے مصحف، لکھ کر حضرت ابن ابی لیلیٰ کے ہاں فروخت کیا تو آپؒ نے ستر درھم میں اُس قرآن کو خریدا۔

''إن عبدالرحمن بن أبي ليلى كتب له نصرانى من أهل الحيرة مصحفا بسبعين درهما''(۲)

بہر حال یہ وقت اور محنت کا مول ہے، قرآن فروشی نہیں ہے، پڑھنا پڑھانا ہو یا کتابت کر کے اسے بیچنا ہو یکساں بات ہے، قرآن فروشی نہیں ہے کیونکہ اس پڑھنے پڑھانے کا عوض لینے سے غرض متعلقہ ''ثواب'' کا سودا نہیں ہے نہ اس سے قرآۃ اور مصاحف سے فرار مقصود ہے بلکہ اس کی مزید نشر واشاعت کے یہ ایک گونہ سامان ہیں۔

پڑھنے پڑھانے یا کتابتِ مصحف کا شعبہ، پہلے سرکاری ہوتا تھا، جن لوگوں کو اس کے لیے فارغ کر دیا جاتا، اس معلم یا کاتب کے مصارف ''بیت المال'' کے ذمہ ہوتے تھے، چونکہ بعد میں یہ صورت بھی انفرادی ہوگی۔

بغیر معاوضہ کے خدمت کرنے سے دین کی حفاظت ہوگی؟

جب حکامِ مملکت کی جانب سے علماء وامورِ طاعات کے حاملین کے لئے وظائف نہیں دیئے جاتے، ائمہ ومؤذنین کی معاشی ضرورت ہے، امامت واذان کا شعبہ ویران ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، شعارِ اسلامی کا تحفظ مقصود ہے، جس کی وجہ سے فقہائے اسلام جواز کا فتوی

---

(۱) التوضیح لشرح الجامع الصحیح، ابن الملقن: ۱۰/۶۲۱، المصاحف: ۲۹۷

(۲) المصاحف: ۲۹۹

دیں اور جہلائے اسلام ناجائز کہیں؟ کیا ہم جس شعبہ کو دین سمجھتے ہیں وہیں دین ہے؟ ان سب دلائل کے باوجود کیسے اجرت کو ناجائز کہا جائے گا؟۔

بعض اہل علم نے اُجرت نہ لینے کو اختیار کیا، تو اسے حرام سمجھنے کی وجہ سے نہیں، بلکہ نہ لینے کو بہتر سمجھنے کی وجہ سے؛ البتہ اسے حرام قرار دینے کا نظریہ صحابہ وتابعین میں سے کسی ایک نے بھی اختیار نہیں کیا۔

کیا صحابہ رضی اللہ عنھم نے امامت اور تعلیمِ قرآن کو روزگار بنایا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ائمہ وعلماء کو شوق نہیں ہوا ہے کہ وہ اسے ذریعہ معاش بنائیں، اگر موجودہ زمانے میں بیت المال کا نظم ہوتا اور ان حضرات کے وظیفے مقرر ہوتے تو اجرت کی ضرورت کیونکر محسوس ہوتی؟ آپ کو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا وہ تاریخی مکالمہ تو ضرور یاد ہوگا جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا تھا کہ آپ تجارت کریں گے تو حکومت کے کام کاج کون دیکھے گا؟ پھر اسی بنیاد پر بیت المال سے آپ کا وظیفہ مقرر کیا گیا، کیا آپ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر بھی اجرت علی الطاعات لینے کا حکم لگا کر معاذ اللہ مطعون کریں گے؟ کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ امورِ خلافت بھی دینی امور اور عبادت کی قبیل سے ہیں۔

کیا ان وظائف کے بعد بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین کو اُجرت لینے ضرورت تھی؟ بلا شبہ نہیں تھی! پھر اس مسئلے میں صحابہ کرام کے عمل کی دلیل طلب کرنا لاعلمی ہے یا پھر جان بوجھ کر عوام کو گمراہ کر کے علماء وائمہ سے بدظن کیا جارہا ہے، ہر دو صورت میں کسی غیر متعلق شخص کا خواہ اس پر دینداری کا لیبل لگا ہو اس موضوع پر گفتگو کرنا سوائے امت میں انتشار پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں ہے، جس کے لیے وہ عنداللہ جواب دہ ہوگا۔

معاوضہ قرآنی آیات کا ہے یا قرآنی خدمت کا؟

رقیتہ دوا نہیں بل کہ دعا ہے، بالخصوص جبکہ وہ قرآن آیات پر مشتمل ہو تو وہ دعا بھی

ہے اور قرآن بھی، اگر ایسے کلماتِ حقہ اور آیاتِ قرآنیہ کے ذریعے کوئی خدمات انجام دی جائے تو وہ معاوضہ خدمت کا ہوتا ہے قرآن کی آیات کا نہیں ہوتا، ہاں! اگر واقعی کوئی بدنصیب شخص قرآن یا اس کی کچھ آیات ہی بیچنے کی نیت سے ایسا کرتا ہے اور اس کے نزدیک قرآن اور آیات کی بس اتنی قیمت ہے تو پھر یقینا حرام اور ناجائز ہے۔

اسکول میں دینی معلم کی اجرت پر آواز

اس بات پر بھی غور کریں کہ کیا مانعین اُن کے بچے سکولوں میں تعلیم حاصل نہیں کرتے؟ اسکولوں میں جہاں دیگر مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے، وہیں اکثر ناظرۂ قرآن، ترجمہ قرآن اور بعض اسکول میں اسلامیات کی تعلیم بھی ہوتی ہے، مساجد میں امام صاحبان کی اُجرت انہیں بہت تکلیف دیتی ہے اور وہ اس کے خلاف بہت آواز اُٹھاتے ہیں، لیکن کبھی انہوں نے سکولوں میں دینی تعلیم پر اُجرت کے خلاف احتجاجاً اپنے بچوں کو گھر بٹھالیا ہو؟(۱) یعنی ایک ہی شخص مسجد مدرسہ میں دینی تعلیم پر اجرت لے تو دین فروش اگر اسکول میں دینی تعلیم پر اجرت لے تو دینی خدمت، واحسرتاہ۔ جبکہ منفعت دونوں میں متعدی ہے، یعنی متاجیر کا بھی فائدہ ہے۔

---

(۱) مستفاد از مضمون: ابو یحیٰ نوری صاحب

علمائے احناف اور تمام مکاتب فکر کا موقف

علمائے احناف کے پاس عدم جواز سے جواز کی ترتیب

موجودہ حالات میں یہ بات ناگزیر ہوگئی ہے کہ بڑی مصلحتوں کے تحفظ کے لئے چھوٹی مصلحت ترک کردی جائے، دینی خدمات پر اجرت لینے کی اجازت اسی قبیل سے ہے، چنانچہ فقیہ ابواللیثؒ کا مشہور قول ہے کہ" میں تین چیزوں کو ناجائز سمجھتا تھا اور اسی کا فتویٰ دیتا تھا جن میں سے ایک تعلیم قرآن پر اجرت لینے کا مسئلہ بھی تھا؛ مگر تعلیم قرآن کے ضائع ہونے کے اندیشہ سے اس کی اجازت دے دی﴿رسائل ابن عابدین﴾ اُس وقت یہ اجازت صرف تعلیم قرآن کی حد تک تھی، جیسا کہ صاحب کنز (جو ساتویں صدی کے ہیں) اور صاحب ہدایہ (جو چھٹی صدی کے ہیں) کی آراء سے معلوم ہوتا ہے، پھر مختصر وقایہ کے مصنف نے جن کی وفات ۷۴۷ھ میں ہے تعلیمِ فقہ پر اُجرت کو جائز قرار دیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ امامت، اذان اور ہر قسم کی دینی تعلیم کے لئے اُجرت لینا درست اور جائز قرار پایا۔

جواز کی ترتیب زمانی

مفتی اقبال صاحب صابری لکھتے ہیں" بڑی مصلحتوں کے تحفظ کے لئے دینی خدمات یا طاعات پر اجرت لینے کی اجازت دی جائے، ایسے حالات کو دیکھ کر بعد کے فقہاء کرام نے دیلی خدمات پر اجرت لینے کے جواز کا فتوی دیا، چنانچہ فقیہ ابوالیث سمرقندی کا مشہور قول ہے کہ میں تین چیزوں کو ناجائز سمجھتا تھا اور اس کا فتوی دیتا تھا جن میں سے ایک قول تعلیم قرآن پر اجرت کا مسئلہ بھی تھا، مگر پھر میں نے تعلیم قرآن کے ضائع ہونے کے اندیشہ سے اس کی اجازت دے دی، لیکن اس وقت تک یا اجازت صرف تعلیم قرآن کی حد تک تھی، جیسا کہ صاحب کنز الدقائق جو ساتویں صدی کے ہیں اور صاحب ہدایہ جو چھٹی صدی کے ہیں۔ کہ ان کی آراء سے معلوم ہوتا ہے۔

پھر" مختصر الوقایہ" کے مصنف نے (جن کی وفات ۷۴۷ھ میں ہے) تعلیم فقہ پر

بھی اجرت کو جائز قرار دیا، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ امامت واذان اور ہر قسم کی دینی تعلیم کے لئے اجرت لینا درست اور جائز قرار پایا۔

علامہ شامی کے رسائل جو رسائل ابن عابدین کے نام سے معروف ہے، میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ ائمہ ثلاثہ ابوحنیفہؒ ابو یوسفؒ محمدؒ کی تمام منقول روایتیں اس پر متفق ہیں کہ طاعات پر اجرت لینا باطل ہے، لیکن ان حضرات کے بعد جو اہل تخریج وترجیح گزرے ہیں، انہوں نے تعلیم قرآن پر اُجرت کے جائز ہونے کا فتوی ضرورتاً دے دیا، اس لئے کہ اس سے پہلے معلمین کو بیت المال سے عطیات ملتے تھے، جو کہ ختم ہو گئے، پس اگر اجرت کے دینے کو ناجائز کہا جائے تو قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے، جس میں دین کا ضیاع ہے، اس لئے کہ معلمین بھی تو کھانے کمانے کے محتاج ہیں، پھر ان کے بعد والے حضرات نے اذان وامامت پر بھی اجرت لینے کے جواز کا فتوی دیا، اس لئے کہ یہ دونوں بھی شعائر میں سے ہیں، ضرورۃً ان دونوں کے بارے میں بھی اجرت لینے کو جائز قرار دیا۔ البحر الرائق میں ہے:

”أما المختار للفتوى في زماننا فيجوز أخذ الأجرة للإمام و المؤذن والمعلم والمفتی“(۱)

ائمہ ثلاثہ اگر یہ زمانہ پاتے تو وہ بھی اُجرت کو جائز قرار دیتے

علامہ شامیؒ کے رسائل جو ”رسائل ابن عابدین“ سے معروف ہیں اس میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ائمہ ثلاثہ ابوحنیفہؒ، ابو یوسفؒ ومحمدؒ کی تمام منقول روایتیں اس پر متفق ہیں کہ طاعات پر اجیر رکھنا باطل ہے، لیکن اِن حضرات کے بعد جو اہل تخریج وترجیح گذرے ہیں انہوں نے تعلیم قرآن پر اُجرت کے جائز ہونے کا فتویٰ ضرورۃً

(۱) البحر الرائق: ۱/ ۲۵۴ بحوالہ: ملازم وملازمت کے شرعی احکام: ۱۴۶

دیا؛اس لئے کہ پہلے معلّموں کو بیت المال سے عطیات ملتے تھے جوکہ ختم ہو گئے ؛اگر اجرت کے دینے اور لینے کو ناجائز کہا جائے تو قرآن کے ضائع ہونے کا شدید خطرہ ہے جس میں دین کا ضیاع ہے ؛اس لئے کہ معلمین بھی تو کھانے کمانے کے محتاج ہیں ،اصحاب تخریج وترجیح کے بعد جو حضرات گذرے اُنہوں نے اذان و اقامت کے بارے میں بھی جوازاً اُجرت کا فتویٰ دیا؛اس لئے کہ یہ دونوں شعائر میں سے ہیں ،ضرورۃً ان دونوں کے بارے میں بھی اُجرت لینا جائز قرار دیا ،یہ ان لوگوں کے فتاویٰ ہیں جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اوران کے اصحاب کے بعد گزرے ہیں اورانہوں نے اس یقین کے ساتھ دیا کہ اگر وہ حضرات بھی اِن کے دور میں ہوتے تو وہ بھی یہی فتوی دیتے اوراپنے پہلے قول سے رجوع کر لیتے ،تمام متون وشروح و فتاویٰ بالاتفاق اس بات کو نقل کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا چیزوں کے علاوہ اور چیزوں پر اُجرت لینا جائز نہیں اوراس کی علت ''ضرورت'' بیان کرتے ہیں یعنی دین کے ضیاع کا خطرہ اوراس علت کی ان حضرات نے تصریح کر دی ہے ۔

ضرورت کی وضاحت

ضرورت کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے زمانے کے لوگوں میں للّٰہیت اورفکرِ آخرت کا غلبہ اور دین وامورِ دین میں رغبت تھی ،اس وجہ سے وہ لوگ خالص ثواب کی نیت سے یہ اعمال انجام دیتے تھے ،اسی طرح جب بیت المال صحیح قائم تھا تو وہاں سے ان تمام حضرات کے وظائف مقرر تھے اور وہ حضرات یکسو ہو کر دین کی خدمت میں مشغول تھے ،لیکن زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں اُمورِ دین کے سلسلے میں سُستی پیدا ہوتی گئی اور اخلاص اُس درجہ کا نہ رہا ،اسی طرح بیت المال کا حال خراب ہوگیا اور وہاں سے مستحقین کو وظائف دینا بند ہو گئے ،اب ایسا مرحلہ آیا کہ اگر اُجرت علی الطاعات کی اِجازت نہ دیجاتی تو شعائرِ دین کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا ،کیونکہ دین کی خدمت کرنے والے اگر حقوقِ واجبہ کی ادائیگی کے لیے کوئی ذریعہِ معاش اختیار کریں تو اپنے اوقات کو دین کی اشاعت کے لیے صرف نہ

کرسکیں گے، جس کی وجہ سے شعائرِ دین ضائع ہوجائیں گے۔مطلب اگر باقاعدہ امام، مؤذن اور معلم کا تقرر نہ کیا جائے تو مساجد میں اذان و جماعت کے اوقات اور دینی تعلیم کا نظم درہم برہم ہوجائے گا۔(۱)

متقدمین احناف نے ناجائز کیوں کہا؟

فرض نماز پڑھانے (یعنی امامت) اذان دینے اور تعلیمِ قرآن (قرآن سکھانے اور پڑھانے) کی اجرت لینے کو متأخرین احناف نے بوجہِ ضرورت جائز قرار دیا ہے، بات یہ ہے کہ فقہائے متقدمین نے اس کو ناجائز قرار دیا تھا اور دین کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والوں کا وظیفہ بھی بیت المال سے مقرر تھا؛ اس لیے یہ دینی امور منظم طریقے پر انجام ہوتے رہے؛ لیکن جب بیت المال کا نظام باقی نہ رہا اور ان بنیادی امور میں بدنظمی اور بے ضابطگی کا احساس ہونے لگا تو فقہائے متأخرین نے صرف اذان، امامت اور تدریس کے لیے اجازت دی اور یہ اجازت دین کی آبیاری اور اس کی بقا کے لیے ہے، اگر کوئی شخص ان ہی طاعات میں اپنے آپ کو مشغول کرے تو اس شخص کے لیے اپنی حاجات وضروریات کو پورا کرنے کے لیے دیگر ذرائع معاش کو اپنانا مشکل ہوجاتا ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر دیگر ذرائع معاش کو اپنائے گا تو پھر ان طاعات کو مستقل پابندی کے ساتھ بجالانا مشکل ہے تو ایسے حالات میں اگر فقہائے متقدمین کے فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے ان طاعات پر اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا جائے تو دین کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا تو بقائے دین کی خاطر فقہائے متاخرین نے یہ فتویٰ دیا کہ ایسے طاعات جن پر دین کی بقاء موقوف ہو ان پر اجرت لینا جائز ہے، مثلاً امامت، موذن، تدریس، قضاء، منصب افتاء۔

”(و) لا لأجل الطاعات مثل (الأذان والحج والإمامة وتعليم القرآن والفقه)، ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه

(۱) مستفاد: دین کے کاموں کی اجرت لینا کیسا ہے؟، صفہ دار الافتاء

والإمامة والأذان، (قوله:ولا لأجل الطاعات) الأصل أن كل طاعة يختص بها المسلم لا يجوز الاستئجار عليها عندنا؛ لقوله عليه الصلاة والسلام:اقرءوا القرآن ولا تأكلوا به، وفي آخر ما عهد رسول الله ﷺ إلى عمرو بن العاص :وإن اتخذت مؤذناً فلا تأخذ على الأذان أجراً؛ ولأن القربة متى حصلت وقعت على العامل، ولهذا تتعين أهليته، فلا يجوز له أخذ الأجرة من غيره كما في الصوم والصلاة، هداية. مطلب تحرير مهم في عدم جواز الاستئجار على التلاوة والتهليل ونحوه مما لا ضرورة إليه،(قوله :ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن إلخ) قال في الهداية:وبعض مشايخنا - رحمهم الله تعالى - استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم؛ لظهور التواني في الأمور الدينية، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن، وعليه الفتوى اهـ. وقد اقتصر على استثناء تعليم القرآن أيضاً في متن الكنز ومتن مواهب الرحمن وكثير من الكتب، وزاد في مختصر الوقاية ومتن الإصلاح تعليم الفقه، وزاد في متن المجمع الإمامة، ومثله في متن الملتقى ودرر البحار"(١)

دینی امور پر اُجرت سے متعلق متقدمین اور متاخرین کے نظریہ کا خلاصہ

فقہاء کے یہاں دینی خدمات میں مشغول افراد کی تنخواہ کا مسئلہ مشہور مسئلہ ہے، اور اس مسئلہ میں علماء کے دو دَور پائے جاتے ہیں، حضراتِ متقدمین کا دَور، اور حضراتِ

(١) الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین: ٦/٥٥

متأخرین کا دَور۔

(۱) حضراتِ متقدمین (وہ علماء جو تیسری صدی کے ختم ہونے سے قبل گزرے ہیں اُن) کا دَور: اس دور میں علماء کا اس مسئلہ کے بارے میں اختلاف رہا ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ، صاحبینؒ اور امام احمدؒ کے ایک قول کے مطابق، اُجرت علی الطاعات کو ناجائز کہتے تھے، جبکہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس کو جائز فرماتے تھے، اس اختلاف کا سبب احادیث و روایات کا اختلاف ہے، بعض روایات سے جواز ثابت ہوتا ہے اور بعض روایات سے عدمِ جواز ثابت ہوتا ہے اور ایک مسئلہ سے متعلق جب روایات مختلف ہوں تو حضراتِ محدثین و مجتہدین، اُصولِ حدیث کو سامنے رکھ کر اُس اختلاف و تعارض کو ختم کرتے ہیں، چنانچہ مذکورہ مسئلہ میں بھی جانبین کی طرف سے ایسا ہی ہوا ہے۔

(۲) حضراتِ متأخرین (تیسری صدی کے بعد کے علماء) کا دور: اِس دور کے علماء اور خاص کر حضراتِ حنفیہ نے اپنے خداداد ملکۂ اجتہاد کی بنیاد پر حالاتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے ضرورت کی وجہ سے اہلِ مدینہ کے مذہب پر فتوی دیا، پھر یہاں سے فقہاء امت یعنی ائمہ اربعہ کا اس مسئلے میں اتفاق ہو چکا ہے کہ مذکورہ اعمال کی اجرت کا لین دین جائز ہے۔

دینی خدام کو تنخواہ نہ دی جائے تو منتظمین کو قید میں ڈالا جائے گا

احناف کے بہت بڑے وکیل امام قاضی خان الحنفی فرماتے ہیں کہ: بلاشبہ حضرات متقدمین نے تعلیم قرآن کریم پر کسی کو اُجرت دے کر ملازم رکھنا مکروہ سمجھا ہے اور اس پر اُجرت لینا بھی مکروہ قرار دیا ہے؛ کیونکہ اس زمانہ میں معلمین کے لیے بیت المال میں عطیات مقرر ہوتے تھے، نیز امورِ دین اور للہ فی اللہ کام کرنے میں ان حضرات کی رغبت زیادہ تھی اور ہمارے زمانہ میں عطیات بھی منقطع ہو چکے ہیں اور آخرت کے معاملے میں لوگوں کی رغبتیں بھی کم ہو چکی ہیں سو اگر ایسے لوگ ناداری کی حالت میں تعلیم کا شغل جاری

رکھتے ہوئے روزی کمانے میں مصروف ہوئے تو ان کی کمائی میں سخت خلل پڑے گا، اس لیے ہم نے یہ کہا کہ یہ اجارہ صحیح ہے اور معلم کے لیے اُجرت واجب ہے، اب اگر تعلیم پانے والے شاگرد کا والد (اور موجود اصطلاح میں مدرسہ، مسجد کی کمیٹی، ادارہ اور مہتمم) معلم کو تنخواہ دینے سے گریز کرے تو اسے گرفتار کیا جائے گا۔

''انما کره المتقدمون الاستیجار لتعلیم القرآن وکرهوا اخذ الاجر علی ذلک لانه کان للمعلمین عطیات فی بیت المال فی ذلک الزمان وکان لهم زیادة رغبة فی امر الدین واقامة الحسبة وفی زماننا انقطعت عطیاتهم وانتقصت رغائب الناس فی امر الاخرة فلو اشتغلوا بالتعلیم بالحاجة الی مصالح المعاش لاختل معاشهم قلنا بصحة الاجارة ووجوب الاجرة للمعلم بحیث لوامتنع الوالد عن اعطاء الاجر حبس فیه اھ''(۱)

امام مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی

امام برہان الدین المرغینانی حنفی (م ۵۹۳ھ) لکھتے ہیں: ہمارے بعض مشائخ نے اس زمانے میں تعلیمِ قرآن پر اجرت لینے کو مستحسن کہا ہے، کیونکہ اب امورِ دینیہ میں سستی ہوگئی ہے اور اسکو ناجائز کہنے میں قرآن مجید کو حفظ کرنا ضائع ہو جائے گا، اور فتوی اسی قول پر ہے۔

''وبعض مشایخنا استحسنوا الاستئجار علی تعلیم القرآن الیوم؛ لأنه ظهر التواني في الأمور الدینیة. ففي الامتناع تضییع حفظ القرآن وعلیه الفتوی''(۲)

(۱) فتاوی قاضی خان: ۳/ ۴۳۴ طبع نولکشور لکھنؤ

(۲) الهدایة في شرح البدایة، ۳: ۲۳۸/ دار إحیاء التراث العربي، بیروت

علامہ بابرتیؒ کا فتوی

علامہ محمد بن محمود بابرتی حنفی (م ۷۸٦ ھ) لکھتے ہیں: متقدمین فقہا نے تعلیم کی اجرت کو اسلئے مکروہ کہا تھا کہ معلمین کو بیت المال سے عطیات ملتے تھے، اوران عطیات کی وجہ سے وہ اپنی معاشی ضروریات میں مستغنی تھے اور وہ لوگ محض ثواب کے لئے تعلیم دینے میں رغبت رکھتے تھے، اور اب یہ چیز باقی نہیں ہے، امام ابوعبد اللہ الخیز اخزی نے کہا کہ ہمارے زمانے میں امام، موذن اور معلم کے لئے اجرت لینا جائز ہے، اسی طرح ذخیرہ میں ہے۔

”إنما كره المتقدمون ذلك لأنه كان للعلمين عطيات من بيت المال فكانوا مستغنين عما لا بدلهم من امر معاشهم و قد كان في الناس رغبة في التعليم بطريق الحسبة و لم يبق ذلك وقال أبو عبد الله الخيزاخزي يجوز في زماننا للإمام و المؤذن و المعلم اخذ الأجرة ذكره في الذخيرة“(۱)

امام حصکفیؒ کا فتوی

امام علاء الدین حصکفی حنفی (م ۱۰۸۸ ھ) لکھتے ہیں: متاخرین نے عبادات مثلا امامت اور تعلیم قرآن وفقہ پر اجرت لینے کے جواز کا فتوی دیا ہے تاکہ احکام شریعہ محفوظ رہیں اور زمانہ کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

”(ويفتى اليوم) أي يفتي المتاخرون (بالجواز) للإجارة (على ذلك) مثل (الإمامة و تعليم القرآن و الفقه) تحرزا عن الندراس و الاحكام تختلف بإختلاف الزمان“(۲)

(۱) عناية على هامش فتح القدير ۸:۴۰/
(۲) الدر المنتقى في شرح الملتقى: ۲/ ۳۸۴، دار إحياء التراث العربي، بيروت

علامہ شامیؒ کا فتوی

رد المحتار میں ہے:

”و بعض مشايخنا رحمهم الله استحسنوا الاستجار على تعليم القرآن اليوم ، لظهور التواني في الأمور الدينيه ، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن ، وعليه الفتوى“(۱)

اور ہمارے بعض مشائخ نے آج کل تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو بہتر قرار دیا ہے، کیونکہ امور دین میں لوگوں میں سستی پیدا ہوگئی ہے، تو ممانعت کی صورت میں اندیشہ ہے کہ حفظ قرآن ضائع ہو جائے گا اور اسی پر اب فتوی ہے۔

عالمگیری کا فتوی

فتاوی عالمگیری میں ہے:

”ومشائخ بلخ جوزوا الاستئجار على تعليم القرآن إذا ضرب لذلك مدة وافتوا بوجوب المسمى كذا في المحيط ، وكذا جواز الاستيجار على تعليم الفقه ونحوه المختار للفتوى في زماننا قول هؤلاء كذا في الفتاوى العتابيه“(۲)

اور مشائخ بلخ نے تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے، جب کہ اس کی مدت معین ہو اور معین شدہ اجرت کے واجب التسلیم ہونے کا فتوی دیا ہے۔ محیط میں بھی اسی طرح ہے اور اسی طرح تعلیم فقہ اور اس کے امثال (جیسے اذان و امامت پر) اجرت لینے کا جواز بھی ہے اور ہمارے زمانے میں فتوی کے لئے انہی لوگوں کا قول

---

(۱) رد المحتار ۹/ ۹۴، کتاب الاجارۃ فی عدم جواز الاستئجار علی التلاوۃ

(۲) الفتاوی الہندیۃ، کتاب الاجارۃ الباب الخامس ۴/ ۴۴۸

مختار ہے۔

فتاوی بزازیہ کا فتوی

فتاوی بزازیہ میں ہے:

"الاستئجار على الطاعات لتعليم القرآن والفقه والوعظ لا يجوز أي لا يحب وأهل المدينة طيب الله ساكنها جوزوه، وبه أخذ الإمام الشافعي، قال في المحيط وفتوى مشائخ بلخ على الجواز۔قال الإمام الفضلي :والمتاجرون على جوازه، وكان الإمام الكرماني يفتي "بدرنا رسيده معلم را خوشنود بكنيد" وفتوى علمائنا على أن الإجارة إن صحت يجب المسمى وإن لم تصح يحب أجر المثل"۔(۱)

طاعات پر عقد اجارہ مثلاً تعلیم قرآن وفقہ اور تدریس و وعظ پر اجرت لینا جائز نہیں، یعنی اجرت واجب نہیں ہوتی، اور اہل مدینہ (طيب الله ساكنها) طاعات پر اجرت لینے کو جائز کہتے ہیں اور امام شافعی اسی کے قائل ہیں، محیط میں فرمایا کہ مشائخ بلخ کا فتوی جواز کا ہے۔

۴۔امام فضلی نے فرمایا کہ متاخرین حنفیہ جواز کے قائل ہیں اور امام کرمانی فتوی دیتے تھے کہ دروازے تک پہنچنے سے پہلے معلم کو خوش کر دو، اور ہمارے علماء کا فتوی ہے کہ اگر عقد اجارہ کی طور پر کیا گیا تو اجرت معینہ واجب ہوگی ورنہ اجر مثل لازم ہوگا۔

فقہ حنفی کی تمام متداول کتب چاہے وہ متون ہوں یا شروح ہوں یا فتاوی ہوں۔ان میں یہ بات تصریح کے ساتھ مذکورہ ہے کہ طاعات پر اجرت لینا جائز ہے۔(۲)

(۱) فتاوی بزازیہ علی حامش الہندیہ: ۲/ ۳۷،کتاب الاجارہ

(۲) بحوالہ: ملازم وملازمت کے شرعی احکام: ۱۴۹۔۱۵۰

دینی امور پر اُجرت سے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا موقف

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے پہلے افضیلت کو بتایا، پھر جواز کو بتایا، چنانچہ: آپ رحمہ اللہ سے ایک آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اُجرت کے بغیر شرعی علوم پڑھانے کیلیے تیار نہیں ہے، تو کیا اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے؟ تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: الحمدللہ، کسی معاوضے اور اُجرت کے بغیر قرآن کریم اور شرعی علوم کی تعلیم دینا اللہ تعالی کے ہاں افضل اور محبوب ترین اعمال میں سے ہے، اور یہ بات دین اسلام میں ایک مسلمہ حقیقت ہے، اسلامی خطے میں رہنے والے کسی بھی شخص سے یہ بات مخفی نہیں ہے۔

صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور دیگر قرآن و حدیث کے مشہور و معروف علمائے کرام اور فقہاء سب کے سب بغیر اُجرت کے تعلیم دیتے تھے، ان میں سے کوئی بھی ایسا فرد نہیں تھا جو اُجرت لے کر تعلیم دیتا ہو (علمائے کرام انبیائے عظام کے وارث ہیں، انبیائے کرام کی وراثت درہم و دینار نہیں ہوتی بلکہ ان کی وراثت علم ہے، جس نے بھی علم حاصل کیا اس نے عظیم نصیب پایا) اور انبیائے کرام علم بغیر اُجرت کے سکھاتے تھے، جیسے کہ نوح علیہ السلام نے فرمایا: ''وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ'' ترجمہ: اور میں تم سے اس پر کوئی اجرت طلب نہیں کرتا، میرا اجر صرف رب العالمین کے ذمے ہے۔(۱) یہی بات ہود، صالح، شعیب، لوط اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام نے کہی تھی اور اسی طرح کی بات خاتم الرسل ﷺ نے فرمائی: ''قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ'' ترجمہ: آپ کہہ دیں: میں اس پر کسی اجرت کا تم سے سوال نہیں کرتا، اور نہ ہی میں تکلف میں پڑنے والا ہوں۔(۲)

قران کریم، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم بغیر اُجرت کے دینا سب اہل علم کے ہاں

(۱) الشعراء: ۱۰۹

(۲) سورہ ص: ۸۶

متفقہ طور پر عمل صالح ہے، بلکہ یہ فرضِ کفایہ ہے، جیسے کہ نبی ﷺ سے صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ: میری طرف سے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔ "بلغوا عنی ولو آیۃ"(۱) اور اسی طرح ﷺ کا فرمان ہے: حاضر غیر حاضر افراد تک بات پہنچا دیں۔ "فلیبغ الشاھد الغائب"

اگر علمائے کرام کا اختلاف ہے تو اس بات پر ہے کہ قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں، اس بارے میں دو موقف ہیں اور امام احمدؒ سے اس کے متعلق دو روایات ہیں: پہلی یہ ہے کہ : شرعی علوم کی تعلیم دینے پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، یہی ابو حنیفہ وغیرہ کا موقف ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ :اجرت لینا جائز ہے، یہ شافعی اور دیگر ائمہ کا موقف ہے، اس کے متعلق حنبلی فقہ میں یہ موقف بھی ہے کہ: اگر ضرورت ہو تو جائز ہے، اگر ضرورت نہیں ہے تو جائز نہیں ہے، جیسے کہ اللہ تعالی نے یتیم کی کفالت کرنے والے کے متعلق فرمایا: "وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ" ترجمہ: اور جو مالدار ہے وہ بچے، اور جو غریب ہے وہ (شرعی) عرف کے مطابق کھالے۔(۲)

اسی طرح شرعی علوم کے اساتذہ کو بیت المال سے دینا بھی جائز ہے، جیسے کہ ائمہ، مؤذنین، اور قاضیوں کو مشاہرہ دیا جاتا ہے، یہ بھی اگر ضرورت ہو تو جائز ہے۔(۳)

کیا مالدار کے لئے بھی دینی کاموں پر اجرت درست ہے؟

کیا مالدار ہونے کے باوجود دینی امور کو ذریعہ معاش بنانا جائز ہے؟ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :اس بارے میں دو موقف ہیں، جو علمائے کرام تعلیمی فائدے کا معاوضہ لینے کو ناجائز کہتے ہیں: ان کے مطابق تعلیمی فریضہ ایسے لوگوں کا خاصہ ہے جو قرآن، حدیث، فقہ کی

(۱) صحیح بخاری، حدیث :۳۴۶۱

(۲) النساء:۶

(۳) مجموع الفتاوی: ۳۰/ ۲۰۴

تعلیم اور امامت، اذان وغیرہ عبادت سمجھ کر کریں، کوئی کافر شخص یہ کام نہیں کر سکتا، یہ صرف مسلمان ہی کریگا۔

لیکن راہگیری، سلائی اور بنائی وغیرہ ایسی خدمات جو مسلمان اور کافر سب کر سکتے ہیں ان کی اجرت لینے کا معاملہ ایسا نہیں ہے، اگر کوئی شخص اجرت کے بدلے میں کوئی کام کرے تو وہ عبادت نہیں رہتا، وہ اجر وثواب کی بجائے صرف اُجرت کا ہی مستحق بنتا ہے؛ کیونکہ اس نے کام اُجرت کیلیے کیا ہے اَجر کیلیے نہیں، اور اگر کوئی کام معاوضہ لینے کیلیے کیا جائے تو وہ عبادت نہیں رہتا، وہ تو عام پیشے کی طرح ہے؛ لہذا جو علمائے کرام دینی سرگرمیوں پر اُجرت لینے کو جائز نہیں سمجھتے ان کا کہنا ہے کہ: دینی سرگرمیاں بطورِ پیشہ سرانجام نہیں دی جا سکتیں کہ وہ عبادت کی بجائے تجارت بن جائیں، جیسے کہ نماز، روزہ، اور تلاوت وغیرہ بطور عبادت تو کی جا سکتی ہیں بطورِ ذریعۂ اُجرت اور تجارت نہیں کی جا سکتیں۔

اور جو علمائے کرام اسے جائز کہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ: چونکہ دینی تعلیم دینے سے علم لینے والے کو بھی فائدہ ہوتا تو اس لیے مستفید شخص فائدے کے عوض میں اُجرت دے سکتا ہے، جیسے کہ دیگر خدمات کے عوض میں اُجرت دیتا ہے؛ لیکن جو علمائے کرام محتاج اور غیر محتاج کے مابین فرق کرتے ہیں تو یہ زیادہ بہتر موقف لگتا ہے: ان کا کہنا ہے کہ: اگر کوئی شخص ضرورت مند ہونے کی وجہ سے شرعی علوم کی تعلیم کو ذریعہ معاش بناتا ہے تو وہ اپنے عمل کو عبادت بنانے کی نیت کر سکتا ہے، ساتھ میں اسے اُجرت لینے کی بھی اجازت ہے، تا کہ اس اُجرت کی وجہ سے اس عبادت کیلیے تیار رہے؛ کیونکہ اہل خانہ کا پیٹ پالنا بھی واجب ہے، چنانچہ غریب آدمی شرعی علوم کی تعلیم کے عوض حاصل ہونے والی اُجرت سے اپنے اس طرح کے واجبات ادا کرتا ہے، لیکن مالدار شخص کا یہ حکم نہیں ہے؛ کیونکہ اسے تو کمانے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس لیے اسے تو تعلیمی سرگرمیاں اُجرت کیلیے کرنے کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ اگر اللہ تعالی نے سے غنی کر دیا

ہے اور شرعی علوم کی تعلیم فرضِ کفایہ ہے تو وہ اس حکم کے تحت آئے گا، اور اگر کوئی بھی اس فریضہ کو ادا نہ کرے گا تو یہ اس مالدار شخص پر فرضِ عین ہو جائے گا۔ واللہ اعلم۔ انتہی مختصراً۔(۱)

ابن تیمیہؒ کے مذکورہ فتوی کی روشنی میں آج جتنے علما کرام دینی خدمات میں مصروف ہیں اُن میں دو فیصد بمشکل ایسے ہوں گے جنہیں اُجرت کی ضرورت نہ ہو، یعنی اکثریت کو اُجرت لینا پڑتا ہے، بہت کم تعداد کی وجہ سے اکریث پر حکم لگانا درست نہیں ہے، نیز جو غنی ہے وہ بالعموم دینی خدمات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں، کیونکہ انہیں اپنے ذرائع آمدنی تجارت، دُکان وغیرہ سے فرصت کہاں ملتی ہے؟

دارالعلوم دیوبند کا فتوی

سوال: کیا مسجد کا امام، موذن، تراویح پڑھانے والے اور مدرسوں میں دینی تعلیم دینے والے اپنے کام کی اجرت لے سکتے ہیں؟ اگر لے سکتے ہیں تو کیا ایسا نبی پاک ﷺ کے دور میں بھی ہوا کرتا تھا؟

حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالی نے دلائل کی روشنی میں امامت، اذان، دینی تعلیم کی تدریس پر اجرت کے لین دین کو جائز قرار دیا ہے تو یہ بلا شبہ جائز ہے اگر چہ نبی پاک ﷺ کے دورِ مسعود میں یہ صورت نہ تھی جس طرح چھپے ہوئے قرآن میں تلاوت کرنا حضرت نبی کریم بلکہ اور بھی بہت بعد تک نہ تھا مگر اب جبکہ ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن کریم نہیں ملتے تو چھاپہ خانوں میں چھپے ہوئے قرآن کریم میں تلاوت کرنا بلا شبہ جائز بلکہ واجب بھی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔(۲)

---

(۱) مجموع الفتاوی: ۳۰/ ۲۰۴، ماخذ: الاسلام سوال وجواب

(۲) دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند، Fatwa ID: 1020-1032/H=10/1437، جواب نمبر: 67183

جامعہ بنوریہ کا فتوی

قرونِ اولیٰ سے لیکر اسلامی خلافت کے اختتام تک ائمہ، مدرسین ،مؤذنین اور قاضی وغیرہ دینی امور پر مامور حضرات کیلئے بیت المال سے وظائف مقرر تھے، اگر دینی امور پر اجرت لینا ناجائز ہوتا تو صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کبھی اس کا ارتکاب نہ کرتے، اور خلفائے راشدین کا عمل امت کیلئے مشعل راہ ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے "علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین" (۱) کہ میرے اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کو لازم پکڑو، اس کے علاوہ بھی دینی امور پر اجرت لینا صحیح اور صریح احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے، اس لئے اب بھی باتفاق ائمہ مجتہدین کے، ان ذمہ داریوں کی اجرت لینا جائز ہے جس کی بناء پر اس کے حاملین دوسرے دنیوی امور انجام دینے سے قاصر ہیں ۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب (۲)

علامہ بن بازؒ کا فتوی

باقی رہا قرآن کی تعلیم یا اس کے ساتھ دم کرکے اجرت لینا یا کوئی ایسا عمل جس کا نفع غیر قاری تک بھی پہنچے تو صحیح احادیث سے اس کا جواز ثابت ہے ۔جیسا کہ حدیث ابوسعید میں ہے کہ ایک آدمی نے سورت فاتحہ کے ساتھ دم کرکے شفاء حاصل ہونے پر مریض سے بطور اجرت بکریوں کا ایک ریوڑ لیا تھا اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کی ایک عورت سے شادی کے لئے مہر یہ مقرر کیا کہ اسے جس قدر قرآن یاد ہے وہ عورت کو بھی یاد کرادے ۔(۳)

---

(۱) مشکوۃ المصابیح: ۱/ ۳۰

(۲) دار الافتاء جامعہ بنوریہ عالمیہ

(۳) فتاوی بن باز رحمہ اللہ جلد دوم

دینی امور پر اُجرت کے جواز پر دائمی فتوی کمیٹی کا فتوی

دائمی فتوی کمیٹی کے علمائے کرام کہتے ہیں: آپ کے لئے قرآن کریم کی تعلیم دینے پر اجرت لینا جائز ہے؛ کیونکہ نبی ﷺ نے ایک لڑکی کو آدمی کے ساتھ اس شرط پر بیاہ دیا تھا کہ وہ لڑکی کو قرآن مجید کی وہ تمام سورتیں یاد کروائے گا جو اسے یاد ہیں، تو یہ سورتیں اس لڑکی کا حق مہر ٹھہریں، اسی طرح ایک صحابی نے کسی کافر مریض پر دم کیا اور دم کرنے سے مریض شفا یاب ہوگیا تو انہوں نے اس پر اجرت لی تھی، اور اسی واقعے کے تناظر میں نبی ﷺ نے فرمایا تھا: ''جن چیزوں پر اجرت لینی جائز ہے ان میں سب سے مستحق قرآن پاک ہے''اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے، شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ عبدالرزاق عفیفی، شیخ عبداللہ بن غدیان، شیخ عبداللہ بن قعود نے جواز کا فتوی دیا ہے۔(۱)

فتاوی محمودیہ کا فتوی

فتاوی محمودیہ میں ہے:

''دین کی اشاعت حسب استطاعت فرض ہے، اول اول جب بیت المال صحیح قائم تھا، اور وہاں سے خدمت دین کرنے والوں کے لئے وظائف مقرر تھے، تو یہ حضرات دل نہاد ہو کر اپنے اوقات کو خدمت دین میں مشغول رکھتے تھے، جو وظیفہ ملتا تھا اس سے حقوق واجبہ ادا کرتے تھے، کسی دوسرے ذریعہ معاش کی ان کو فکر نہیں تھی، حضرت عمرؓ نے بھی بیت المال سے وظائف مقرر کئے تھے، جیسا کہ نصب الرایہ میں ہے۔

پھر جب بیت المال کا حال خراب ہوگیا، مستحقین کو وہاں سے وظیفہ ملنا بند ہوگیا تو اس وقت کے مجتہد فقہاء نے ''استیجار علی تعلیم القرآن والفقه والا مامه والتاذین'' کی اجازت دے دی، تاکہ اسلام کے شعائر محفوظ رہ سکیں اور دین ضائع نہ

(۱) فتاوی اللجنة الدائمة ۱۵/ ۹۶

ہو، اس لئے خدمت دین کرنے والے حضرات اگر حقوق واجبہ کی ادائیگی کے لئے کوئی ذریعہ معاش اختیار کریں، تو اپنے اوقات کو تعلیم و تدریس میں صرف نہیں کر سکیں گے، جس سے اشاعت کی خدمت نہیں ہو سکے گی اور دین ضائع ہو جائے گا، اگر کوئی اور ذریعہ اختیار نہ کریں، تو حقوق واجبہ کے ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں، لہذا دونوں پہلوؤں کی رعایت کرتے ہوئے اس کی اجازت دی گئی"۔(۱)

احسن الفتاوی کا فتوی

احسن الفتاوی میں ہے:

"امامت، اذان، کتب دینیہ و قرآن کریم کی تعلیم اور دوسری ہر قسم کی خدمات دینیہ پر تنخواہ لینا جائز ہے، حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے دور میں ان حضرات کو وظیفے اور تنخواہیں دیں اور خلفائے راشدین کا عمل ہمارے لئے حجت ہے"۔(۲)

چنانچہ نصب الرایہ میں امام زیلعی نے مرد کا عمل نقل کیا ہے:

"وقد روى عن عمر بن الخطاب رضى الله عنه أنه كان يرزق المعلمين، ثم أسند عن إبراهيم بن سعد عن أبيه أن عمر بن الخطاب رضى الله عنه كتب إلى بعض عماله أن أعط الناس على تعليم القرآن - انتهى كلامه" (۳)

کفایت المفتی کا فتوی

کفایت المفتی میں ہے:

(۱) فتاوی محمودیہ ۱۷/ ۲۵

(۲) احسن الفتاوی ۷/ ۲۷۹

(۳) نصب الرایۃ ۴/ ۱۳۷، بحوالہ: ملازم و ملازمت کے شرعی احکام: ۱۴۹

''متاخرین حنفیہ نے یہ دیکھ کر کہ بیت المال کے عطیات موقوف ہو گئے اور ذرائع معیشت میں دشواریاں پیدا ہوگئیں اور امور دین میں سستی اور بے پرواہی ظاہر ہوگئی، پس ایسی حالت میں عدم جوازِ اجرت کا حکم رہنے سے دین اور شعائر مذہب کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لئے انہوں نے اس مسئلہ میں امام شافعی اور اہل مدینہ کا قول اختیار کرلیا''(۱)

بریلوی علماء کا فتوی

صدرالشریعہ مفتی امجد علی اعظمی حنفی (م ۱۳۶۷ھ) لکھتے ہیں:

طاعت وعبادت کے کاموں پر اجارہ کرنا جائز نہیں مثلاً اذان کہنے کے لیے امامت کے لیے قرآن وفقہ کی تعلیم کے لیے حج کے لیے یعنی اس لیے اجیر کیا کہ کسی کی طرف سے حج کرے، متقدمین فقہا کا یہی مسلک تھا مگر متأخرین نے دیکھا کہ دِین کے کاموں میں سستی پیدا ہوگئی ہے اگر اِس اجارہ کی سب صورتوں کو ناجائز کہا جائے تو دِین کے بہت سے کاموں میں خلل واقع ہوگا اُنھوں نے اس کلیہ سے بعض امور کا استثنا فرمادیا اور یہ فتویٰ دیا کہ تعلیم قرآن وفقہ اور اذان وامامت پر اجارہ جائز ہے کیونکہ ایسا نہ کیا جائے تو قرآن وفقہ کے پڑھانے والے طلبِ معیشت میں مشغول ہوکر اس کام کو چھوڑ دیں گے اور لوگ دِین کی باتوں سے ناواقف ہوتے جائیں گے۔اسی طرح اگر مؤذن وامام کو نوکر نہ رکھا جائے تو بہت سی مساجد میں اذان وجماعت کا سلسلہ بند ہوجائے گا اور اس شعار اسلامی میں زبردست کمی واقع ہوجائے گی۔(۲)

مفتی عبدالقیوم ہزاروی صاحب لکھتے ہیں: معاوضہ دینی کاموں کا نہیں لیا جاتا، بلکہ پابندی وقت کا لیا جاتا ہے، اگر اتنا وقت روزی کمانے کے لئے لگایا جائے تو روزی کما سکتا

(۱) کفایت المفتی: ۷/۳۳۰،دارالاشاعت

(۲) بہارِشریعت،: ۳/۱۴۵،مکتبۃ المدینہ،کراچی

ہے،لیکن مذہبی امور کی انجام دہی مسئلہ بن جائے گی، نہ وقت پر اذان، نہ نماز، نہ مسجد کی صفائی، نہ کھولنے اور بند کرنے اور دیگر اشیاء کی حفاظت ہوسکے گی۔اب جو شخص ان تمام امور کو پابندی سے ادا کرے گا وہ اکثر معاش کمانے کے لئے معقول بندوبست نہیں کرسکتا۔ حالانکہ اس پر اپنا، اپنے والدین، بیوی بچے اور دیگر زیر کفالت افراد کا نان ونفقہ اور ضروریات زندگی مہیا کرنا بھی فرض ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد، آپ کے جانشین، خلیفہ اول اور مسلمانوں کے پہلے منتخب حکمرانوں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب یہ معاشی مسئلہ پیش ہوا،تو محدثین کرام کی زبانی مسئلہ اور اس کا جمہوری اسلامی حل سن لیجئے،حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے،فرمانے لگے،میری قوم کو معلوم ہے کہ میرا کاروبار،میرے اہل وعیال کا خرچہ بخوبی پورا کرتا ہے۔اور اب میں مسلمانوں کے معاملات میں مصروف ہوگیا ہوں، اب ابوبکر کے اہل وعیال اس مال (بیت المال) سے کھائیں گے اور وہ مسلمانوں کے امور نمٹائیں گے۔(۱)

پس آج بھی دینی فرائض انجام دینے والے مسلمانوں کے دینی امور نمٹا رہے ہیں۔ اور اس وقت کا حق الخدمت لے رہے ہیں۔علامہ شامی فرماتے ہیں۔

”ان المتقدمين منعوا اخذا الاجره على الطاعات، وافتى المتاخرون بجواز على التعليم والامامة. كان مذهب المتاخرين هو المفتى به“

متقدمین علماء نے عبادات پر اجرت لینے کو منع کیا، اور متاخرین علماء نے تعلیم وامامت پر اجرت جائز ہونے کا فتوی دیا ہے۔۔۔اور فتوی متاخرین کے مذہب پر دیا جاتا ہے۔(۲)

---

(۱) صحیح بخاری: ۱/ ۲۷۸

(۲) ردالمختار شامی: ۴/ ۴۱۷،طبع کراچی) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب، مفتی : عبدالقیوم ہزاروی

بریلوی دعوتِ سلامی کا فتوی

فی زمانہ امامت، اذان دینے، قرآن و حدیث اور دیگر دینی علوم پڑھانے پر تنخواہ لینا جائز ہے، البتہ اگر کوئی فقط پیسے کمانے کے لیے یہ کام کرتا ہے تو ان امور کا جو ثواب بیان ہوا، وہ اسے حاصل نہ ہوگا ہاں اگر اصل مقصد دین کی خدمت ہے تنخواہ اس لیے لیتا ہے کہ اپنا اور اہل وعیال کا گزر بسر کر سکے اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو فی سبیل اللہ کام کرتا اس صورت میں اللہ عزوجل کی رحمت سے امید ہے کہ ثواب کا بھی حقدار ہوگا۔

ابو داؤد شریف میں حدیث مبارکہ ہے:

"عن رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: العامل علی الصدقة بالحق کالغازی فی سبیل اللہ حتی یرجع الی بیته"

رافع بن خدیج سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ عزوجل کی رضا کی کے لئے حق کے مطابق صدقہ وصول کرنے والا اپنے گھر لوٹنے تک اللہ عزوجل کی راہ میں جہاد کرنے والے غازی کی طرح ہے۔"(۱)

اس کے تحت مفتی احمد یار خان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اس حدیث سے معلوم ہوا اگر نیت خیر ہو تو دینی خدمت پر تنخواہ لینے کی وجہ سے اس کا ثواب کم نہیں ہوتا، دیکھو ان عاملوں کو پوری اُجرت دی جاتی تھی مگر ساتھ میں یہ ثواب بھی تھا۔ چنانچہ مجاہد کو غنیمت بھی ملتی ہے اور ثواب بھی، حضرات خلفائے راشدین سوائے حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنھم) کے سب نے خلافت پر تنخواہیں لیں مگر ثواب کسی کا کم نہیں ہوا، ایسے ہی وہ علماء یا امام و مؤذن جو تنخواہ لے کر تعلیم، اذان، امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں اگر ان کی نیت خدمت دین کی ہے

(۱) سنن ابوداؤد: ۲/۵۹، مطبوعہ لاہور

ان شاء اللہ عزوجل ثواب بھی ضرور پائیں گے۔"(۱)

علامہ ابن عابدین شامیؒ رد المحتار میں اجرت لینے والے مؤذن کو اذان دینے کا ثواب ملنے یا نہ ملنے کی بحث میں فرماتے ہیں:

" قد يقال إن كان قصده وجه الله تعالى لكنه بمراعاته للأوقات والاشتغال به يقل اكتسابه عما يكفيه لنفسه وعياله فيأخذ الأجرة لئلا يمنعه الاكتساب عن إقامة هذه الوظيفة الشريفة ولولا ذلك لم يأخذ أجرا فله الثواب المذكور بل يكون جمع بين عبادتين وهما الأذان والسعي على العيال وإنما الأعمال بالنيات

یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر وہ (مؤذن) رضائے الٰہی کا قصد کرے لیکن اوقات کی پابندی اور اس کام میں مصروفیت کی بنا پر اپنے عیال کے لئے قدرِ کفایت روزی نہ کما سکے۔ چنانچہ وہ اس لئے اجرت لے کہ روزی کمانے کی مصروفیت کہیں اسے اِس سعادتِ عظمیٰ سے محروم نہ کروادے اور اگر اسے مذکورہ مجبوری نہ ہوتی تو وہ اجرت نہ لیتا تو ایسا شخص بھی مؤذن کے لئے ذکر کردہ ثواب کا مستحق ہوگا بلکہ وہ دوعبادتوں کا جامع (یعنی جمع کرنے والا) ہوگا، ایک اذان دینا اور دوسری عیال کی کفالت کے لئے سعی کرنا، اور اعمال کا ثواب نیتوں کے مطابق ہوتا ہے۔"(۲)

اہلِ حدیث کا فتوی

واضح ہو کہ مسئلہ مذکورہ بالا میں اہل حدیث اور حنفی حضرات کا اختلاف ہے، اہل حدیث

---

(۱) مراۃ المناجیح: ۳/۱۸، ضیاء القران

(۲) رد المحتار مع درمختار: ۲/۴۷، مطبوعہ کوئٹہ بحوالہ: دارالافتاء اہلسنت، محمد سجاد عطاری مدنی صاحب، فتوی نمبر: Web:32، تاریخ اجراء: 01 جمادی الاولی 1442ھ/ 17 دسمبر 2020ء، دعوت اسلامی

اور جمہور علماء قرآن وحدیث اور دینیات کی تعلیم پر اجرت ومشاہرہ لینا جائز سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں اور متقدمین میں احناف اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ اور متاخرین حنفیہ اہل حدیث کے متفق ہو گئے ہیں، تفصیل اس کی ''فتاویٰ نزیریہ جلد دوم کتاب الاجارۃ''

اب تو مدت مدید سے اس کے جواز پر قریباً تمام امت محمدیہ ﷺ کا اجماع ہو رہا ہے۔ عرب وعجم کے تمام علماء تعلیم وتبلیغ بلکہ آذان واقامت نماز پر تنخواہیں، لے رہے ہیں، کسی کی تنخواہ سرکاری بیت المال سے مقرر ہے، اور کسی کی انجمن یا کسی جماعت کی طرف سے معین ہے، کسی کو کوئی ایک ہی مالدار شخص تنخواہ دے رہا ہے، رمضان شریف میں نماز تراویح میں حفاظ قرآن مجید سناتے ہیں، جب آخر رمضان میں ختم کرتے ہیں، تو اُن کو بہت کچھ دیا جاتا ہے، اہل حدیث اور حنفیہ کا اسپر تعامل ہے، کوئی کسی کو حرام خور نہیں کہتا اسی طرح مدارس عرب وعجم میں تعلیم وتبلیغ پر مشاہرے لئے جارہے ہیں اور دیئے جارہے ہیں کسی عالم محدث فقیہ نے حرام کا فتویٰ دے کر اس کے انسداد کی کوشش نہیں کی، فرقہ ناجیہ اہل حدیث کا بھی یہی تعامل چلا آرہا ہے۔(۱)

کیا تعلیم دین پر اُجرت کو دینی فروشی کہنا درست ہے؟

مجھے بتائیں کہ میں اسلام کے قریب کیسے آسکتا ہوں اور اسلام کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکوں، کیا کسی شخص کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اسلام کو فروخت کرے مثلاً لوگوں کو قرآن سکھانے کی اجرت لینا، لوگوں سے کتابیں، آڈیو لیکچر یا قرآن کی اجرت لینا؟

جواب: قرآن کریم سکھانے کی اجرت اور اسلامی کتابیں فروخت کرنا وغیرہ امور کو اسلام کے بیچنے سے تعبیر کرنا بھی درست نہیں، نیز یہ اسلام کا بیچنا بھی نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔(۲)

---

(۱) فتاویٰ علمائے حدیث: ۱۲/ ۱۶۸

(۲) دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند فتوی 1614 :=1238/ھ، جواب نمبر 6554 :

تنخواہ لینا دین فروشی کب ہے؟

☆[ایک مرتبہ مولانا مرتضی حسن صاحب نے حضرت حکیم الامت سے عرض کیا : حضرت تنخواہ لینے میں میری طبیعت کو الجھن ہوتی ہے، کیونکہ یہ تو صاف دین فروشی ہے، حکیم الامتؒ نے جواب دیا: ہرگز یہ دین فروشی نہیں، آج کل تنخواہ لینی چاہئے کیونکہ اس سے کام اچھی طرح ہوگا اور اس کا بار طبیعت پر رہے گا اور بدون تنخواہ لئے کام کا بار نہیں ہوتا، مولانا مرتضی حسن صاحب نے عرض کیا: تنخواہ لینے میں یہ تو مصلحت معلوم ہوئی مگر اس ضرر کا کیا علاج ہے اس میں دین فروشی ہے؟ اس کے جواب میں حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا : اسکی پہچان کہ دین فروشی ہے یا نہیں ہے؟ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ایک جگہ اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ اس کے گذارہ کے لئے کافی ہے، پھر دوسری جگہ اس سے زیادہ تنخواہ مل رہی ہے، جس میں پہلی جگہ سے زیادہ دینی خدمت کی صورت نہیں ہے تو اگر وہ پہلی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے تو بے شک دین فروشی ہوگی۔]

حاصل یہ کہ فقہائے کرام کی مذکورہ تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دینی امور پر اُجرت لینا یا دینا جائز ہے، چونکہ (۱) حکامِ مملکت کی جانب سے علما و مشائخ اور امورِ طاعات کے حاملین کے لئے وظائف کا بند ہوجانا۔(۲) ائمہ و مؤذنین کی معاشی ضرورت ۔(۳) امامت و اذان کا شعبہ ویران ہوجانے کا خوف ۔(۴) شعارِ اسلامی کا تحفظ ۔

دینی خدمات کی تنخواہ لینے پر اعتراضات کی حقیقت

پہلا اعتراض: انبیاء کرام اپنی محنت کی اجرت نہیں مانگتے تھے

اللہ رب العالمین نے مختلف رسولوں کا تذکرہ کیا اور فرمایا ہے: ”وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ“ میں تم سے اجر کا سوال نہیں کرتا، کہیں ذکر ہے ”قُلْ مَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ“ اگر میں تم سے کوئی اجر مانگتا ہوں تو وہ تمہارے لیے ہی ہے، کہیں فرمایا۔”إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ“ میرا اجر تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے؛ معلوم ہوا کہ اجرت لینا انبیاء کا شیوہ نہیں ہے، لہذا وارثین انبیاء کو بھی دینی امور پر اجرت نہیں لینی چاہئے۔

جواب: پہلی بات: یہ خطاب انبیاء کرام کا کفار سے تھا، یعنی اُجرت نہ لینے کی بات کفار سے تھی، اپنوں سے نہیں، چنانچہ قرآنِ مجید میں جہاں جہاں اس طرح کی آیات ہیں اس کا پس منظر دیکھ لینا چاہئے، انبیاء علیہم السلام اپنوں سے مال ومتاع قبول فرماتے تھے، صحابہ کرام سے ہدایا وتحائف قبول کرنا احادیث میں بکثرت ثابت ہے، اسی طرح موجودہ زمانہ میں دینی امور پر اُجرت بھی اغیار سے نہیں لی جاتی ہے، بلکہ مسلمانوں سے ہی لی جاتی ہے۔

دوسری بات: پیغمبر ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم تم سے مطالبہ نہیں کرتے؛ لیکن اگر تم خود سے بلا مطالبہ نبی کو دوگے تو؟ یہ نہیں فرمایا کہ کوئی خود سے دے تو بھی قبول نہیں لیں گے، مطالبہ کرنے کی نفی کی ہے، اجرت قبول کرنے اور لینے کی نفی نہیں ہے۔

تیسری بات: اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان میں فرمایا ہے: «قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَن شَاءَ أَن يَتَّخِذَ إِلَى رَبِّهِ سَبِيلاً“ (۱)

تم میں سے جو چاہتا ہے کہ مجھے کچھ دے دے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرلے، یہ اس کی مرضی ہے، بہت معتدل طریقہ سے مسئلہ کی وضاحت ہوگئی۔

چوتھی بات: کیا نبی کریم ﷺ کبھی مال قبول ہی نہیں کیا؟ اِس رسالہ کے شروع میں

---

(۱) الفرقان: ۵۷

بارہ دلائل واحادیث میں گذر چکا، جن میں پہلی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "واضربوا لي معكم سهما" مجھے بھی حصہ دو اس میں سے، یہ کسی بھی جہت سے ہو بہر حال قبول فرمایا۔

پانچویں بات: مال غنیمت میں سے خمس اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے لیے مخصوص کیا ہے، آپ ﷺ جہاد میں جائیں یا نہ جائیں، جبکہ اصول یہ ہے کہ غنیمت کے مال میں سے حصہ ملتا ہے جو جہاد میں شریک ہوتا ہے، جو شریک نہیں ہوتا اس کو حصہ نہیں ملتا لیکن رسول اللہ ﷺ کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہوا تھا، وہ چاہے جائیں، چاہے نہ جائیں، پانچواں حصہ، خمس، وہ نبی ﷺ کو دیا جائے گا، باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم کیے جائیں گے۔ "وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ" جان لو جو بھی مال غنیمت تم حاصل کرتے ہو "فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ" اللہ و رسول کے لیے پانچواں حصہ ہے۔(۱)

وفد عبد القیس بحرین سے مدینہ آیا، جب وہ واپس جانے لگے تو نبی کریم ﷺ نے انہیں چار کام کرنے کا حکم دیا اور چار کاموں سے منع کیا، جن چار کاموں کے کرنے کا حکم دیا ان میں سے "وأن تعطوا من المغنم الخمس" اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرو۔(۲)

کہاں بحرین کے لوگ اور کہاں مدینہ منورہ، مگر جب وہ جنگ و جہاد کریں، اگر ان کو مال غنیمت ملتا ہے تو پانچواں حصہ مدینہ میں نبی کریم ﷺ کو دیا جائے گا، یقیناً یہ جو آپ ﷺ دین کا کام کر رہے تھے، امت کی فلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا، اگر یہ حصہ متعین نہ کیا جاتا تو بشری ضرورتیں دینی ذمہ داریوں کے ساتھ کیسی پوری ہوتیں؟ آپ ﷺ امام، خطیب، حاکم، مفتی، مجاہد، قاضی، غرض کہ ہر طرح کا دین کا کام کر رہے تھے، غرض یہ کہ عقل سلیم والوں

---

(۱) الأنفال: ۴۱

(۲) صحیح بخاری کتاب الایمان باب اداء الخمس من الایمان حدیث: ۵۳

پر واضح ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ کی دینی خدمات پر دنیوی ضرورتوں کی تکمیل کا نظام کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا، معترض سیرتِ رسول کے تمام گوشوں سے ناواقف ہے۔

دوسرا اعتراض: تنخواہ لینا اخلاص کے منافی ہے

یہ کیا جاتا ہے کہ اجرت لینا اخلاص کے منافی ہے، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے: "وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ" (۱) انہیں حکم دیا گیا تھا کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے دین کو خالص کر کے اللہ کی عبادت کریں، دینی امور جتنے بھی ہیں یہ سارے کے سارے عبادت ہیں، ان میں اخلاص شرط ہے، اگر اُجرت لے لی جائے تو اخلاص ختم ہو جاتا ہے، اسی اُصول کو رسول اللہ ﷺ نے یوں بیان کیا ہے: "إنما الأعمال بالنيات "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ "وإنما لكل امرئ ما نوى" بندے کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔(۲)

اگر اسلامی شعبے کی خدمت پر اجرت لی جائے تو اس کا اجر ختم ہو جائے گا۔

جواب: پہلی بات :اخلاص کسے کہتے ہیں؟ اخلاص اور خلوصِ نیت کی تعریف یہ ہے: کسی فعل کی طرف اپنے ارادے کو بندہ متوجہ کرے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کے لیے۔ "الإرادة المتوجهة نحو الفعل لابتغاء مرضات الله وامتثال حكمه" اس تعریف میں تنخواہ نہ لینے کی شرط کہاں ہے؟ اگر اس کے اندر کوئی غرض جو شرعاً جائز ہو، وہ شامل ہو جائے تو اخلاص ختم کیسے ہو جاتا ہے؟۔

اس کی مثال اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حاجیوں سے کہا، حج کرنے میں اخلاص شرط لگائی ہے، جتنی بھی عبادات ہیں، سب کے اندر اخلاص شرط ہے؛ لیکن ہر عبادت میں اخلاص کا ذکر اللہ نے بعد میں کیا ہے اور عبادت کے فرض ہونے کا ذکر اللہ نے پہلے کیا ہے، سوائے حج

(۱) البينة: ۵

(۲) صحیح بخاری، حدیث: ۱

کے، ایسی عبادت ہے کہ اس میں ریاکاری کا شائبہ زیادہ پایا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اخلاص کو مقدم رکھا، فرمایا: "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلاً" (۱) اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں پر فرض ہے بیت اللہ کا حج کرنا، ان لوگوں کے لیے فرض ہے "مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلاً" جو راستے کی طاقت اور استطاعت رکھتا ہے، اس کے باوجو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُواْ فَضْلاً مِّن رَّبِّكُمْ" (۲) اگر تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، یعنی اگر کوئی آدمی اپنے ملک سے حج کرنے کے لیے سعودیہ جاتا ہے اور وہ ساتھ حج کے دوران، حج کے ایام میں تجارت بھی کر لیتا ہے، خرید و فروخت بھی کر لیتا ہے، اللہ کا فضل، رزق وہ کما لیتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ" تم پر کوئی حرج اور گناہ نہیں ہے، حج کرنا عبادت ہے، حج کے ساتھ مال کما لے، تجارت کر لے، تو کوئی حرج نہیں ہے، یعنی حج کا ثواب ختم نہیں ہوگا، اور نہ حج کا ثواب کم ہوگا، تو اگر دینی امور پر اجرت لے لی جائے تو اس سے اخلاص ختم کیسے ختم ہو جائے گا؟۔

دوسری بات: کیا یہ اصول صحیح ہے کہ جس عبادت میں مال ہو وہ عبادت اخلاص سے خالی ہو جاتی ہے؟ اگر یہ اصول صحیح ہے تو جہاد میں بھی مالِ غنیمت ہے، پھر تو مجاہد کو بھی ثواب نہیں ملنا چاہئے، بلکہ شہادت کا بھی اجر نہیں ملنا چاہئے؛ کیوں کہ اگر وہ زندہ رہتا تو مالِ غنیمت پاتا، شہید ہو گیا اس لئے مال نہیں پا سکا، جبکہ یہ اُصول سراسر نادانی و جہالت پر مشتمل ہے۔

تیسری بات: کیا یہ اُصول بھی درست ہے کہ "جس عبادت میں پیسہ نہیں ملتا ہے اس عبادت کا اخلاص پر مشتمل رہنا یقینی ہے"، خواہ عابد کی نیت وظاہر کیسا بھی ہو؟ پھر تو ہر نمازی، حاجی و روزہ دار مخلص ہونا چاہئے، کوئی ریاکار نہیں ہوگا، نیز حدیث میں جس عالم، مجاہد اور سخی کا ذکر ہے کہ انہیں ان کی ریاکاری کی وجہ سے جہنم میں ڈالا جائے گا، اِن میں سے کسی نے اپنی

(۱) آل عمران: ۹۷۔
(۲) البقرۃ: ۱۹۸

نیکی پر پیسہ نہیں لیا، پھر کیسے کہا جائے گا کہ جس نیکی میں اُجرت نہ ہو اُس نیکی کا اخلاص پر مشتمل ہونا یقینی ہے، پتہ چلا کہ یہ اُصول بھی درست نہیں ہے،لہذا تنخواہ لینے و نہ لینے سے اخلاص کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

چوتھی بات: اجر کے دو معنی ہوتے ہیں:

۱۔اُجرت و مزدوری۔ ۲۔اجر و ثواب۔اجر و ثواب تو لوگوں سے لیا ہی نہیں جاسکتا، وہ تو صرف اللہ رب العالمین ہی دے سکتے ہیں،اور جو اُجرت ہے وہ لوگوں سے لی جاسکتی ہے، لوگ دے بھی سکتے ہیں،مثلاً تجارت کو خالصتاً دنیاوی کام سمجھا جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: سچا، امانتدار تاجر ہے اللہ کے رسول نیک مقرب فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔ "التاجر الصدوق الأمين مع الكرام السفرة البررة" (۱) یعنی ایک بندہ کرتجارت کے ذریعہ دنیا کمارہا ہے؛لیکن اس کے صادق و امین ہونے کی وجہ سے اس کو اجر بھی مل رہا ہے،مطلب یہ کہ اجر و اُجرت دونوں اکھٹے ہوسکتے ہیں،معلوم ہوا کہ اگر کوئی اُجرت لیتا ہے تو وہ اَجر سے محروم نہیں ہوتا،اَجر علیحدہ چیز ہے اور اُجرت علیحدہ چیز ہے۔

سیدنا عمرؓ نے ایک آدمی کو عامل بنایا، جب وہ اپنا کام مکمل کر کے آیا تو سیدنا امیر المؤمنین عمر رض نے ان کو کچھ وظیفہ دیا، کچھ تنخواہ دی، وہ کہنے لگے کہ میں نے یہ کام اللہ کے لیے کیا ہے،تنخواہ لینے کے لیے نہیں کیا،سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ہاں! جو تو مجھے کہہ رہا ہے،میں نے نبی کریم ﷺ سے یہی کہا تھا؛لیکن آپ ﷺ نے مجھے سمجھایا تھا کہ ایسا کام نہیں کرنا۔ "ما أعطيك من غير اسراف فخذه" جو تجھے اپنے آپ دیا جارہا ہو، اسے لیا کر۔ "فتموله" اس کو اپنا مال بنا۔(۲)

(۱) جامع الترمذی أبواب البیوع باب ماجاء فی التجار وتسمیۃ النبی ﷺ حدیث :۱۲۰۹

(۲) صحیح بخاری کتاب الأحکام باب رزق الحکام والعاملین علیہا حدیث :۷۱۶۴

تیسرا اعتراض: دینی امور پر اجرت لینے سے ثواب نہیں ملتا ہے

امامت یا اسی طرح کا کوئی دینی فریضہ انجام دینے پر اُجرت لینا جائز ہے تو کیا اس پر ثواب بھی ملتا ہے؟ اگر ملتا ہے تو دلیل کیا ہے؟

جواب: فقہائے متاخرین نے دین کے بقاء کی وجہ سے امامت پر تنخواہ کو جائز قرار دیا ہے اور ثواب ملنے میں تفصیل ہے، حضرت تھانوی ؒ نے لکھا ہے کہ اگر امام کی یہ نیت ہے کہ اگر مجھ کو اس سے زیادہ دوسری جگہ تنخواہ ملے گی، تو میں اس کو چھوڑ کر اس کو اختیار کرلوں گا، تب تو ثواب نہیں ملے گا، اور اس کو اُجرت محضہ کہا جائے گا اور اگر یہ نیت رہے کہ زیادہ کے لئے بھی اس کو نہ چھوڑوں گا تو ثواب ضائع نہ ہوگا اور اس کو اجرت نہ کہا جاوے گا، بلکہ نفقہَ حبس وکفایت مثل رزق قاضی کہا جاوے گا۔(۱)

دینی امور پر اجرت لینے سے دوگنا ثواب ملتا ہے

☆ علامہ ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ رد المحتار میں اجرت لینے والے مؤذن کو اذان دینے کا ثواب ملنے یا نہ ملنے کی بحث میں فرماتے ہیں: یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر وہ (مؤذن) رضائے الٰہی کا قصد کرے لیکن اوقات کی پابندی اور اس کام میں مصروفیت کی بنا پر اپنے عیال کے لئے قدرِ کفایت روزی نہ کما سکے۔ چنانچہ وہ اس لئے اجرت لے کہ روزی کمانے کی مصروفیت کہیں اسے اِس سعادتِ عظمیٰ سے محروم نہ کروا دے اور اگر اسے مذکورہ مجبوری نہ ہوتی تو وہ اجرت نہ لیتا تو ایسا شخص بھی مؤذن کے لئے ذکر کردہ ثواب کا مستحق ہوگا بلکہ وہ دو عبادتوں کا جامع (جمع کرنے والا) ہوگا، ایک اذان دینا اور دوسری عیال کی کفالت کے لئے سعی کرنا، اور اعمال کا ثواب نیتوں کے مطابق ہوتا ہے۔

" قد يقال إن كان قصده وجه الله تعالى لكنه بمراعاته

(۱) امداد الفتاوی: ۷/۲۹۷، جدید، سوال: ۱۸۹۶، بحوالہ: آن لائن دارالافتاء دارالعلوم دیوبند، جواب نمبر:: 607460

للأوقات والاشتغال به يقل اكتسابه عما يكفيه لنفسه وعياله فيأخذ الأجرة لئلا ليمنعه الاكتساب عن إقامة هذه الوظيفة الشريفة ولولا ذلك لم يأخذ أجرا فله الثواب المذكور بل يكون جمع بين عبادتين وهما الأذان والسعي على العيال وإنما الأعمال بالنيات"۔(۱)

تنخواہ لینا اخلاص وثواب کے منافی نہیں ہے

مستقل فتوی کمیٹی کے علماء کرام سے درج ذیل سوال کیا گیا: اگر اس کے جواز کا فتوی ہو تو کیا ماہانہ اجرت لینے سے اللہ تعالی کے ہاں ثواب کے حصول میں کوئی کمی تو نہیں ہوتی؟

کمیٹی کے علماء کا جواب تھا: "قرآن مجید کی تعلیم دینا اور تعلیم حاصل کرنا اللہ تعالی کا قرب حاصل کرنے کے لیے افضل اور بہتر کام ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ جب اس میں اخلاص نیت پائی جائے، اور پھر نبی کریم ﷺ نے بھی قرآن مجید کی تعلیم کے حصول پر ابھارتے ہوئے یہ فرمایا: "تم میں سے سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن مجید کی خود بھی تعلیم حاصل کرے، اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دے اور قرآن مجید کی تعلیم دینے والے مدرس حضرات کا تنخواہ اور اس پر اجرت لینا ان کے حصول ثواب کے منافی یا کمی کا باعث نہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ جب وہ اس میں اخلاص نیت سے کام لیں۔(۲)

چوتھا اعتراض: اُجرت کے بجائے ہدیہ لینے سے ثواب اکارت نہیں ہوگا

جو لوگ اجرت لینے کے قائل نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اُجرت طے نہ کی جائے، البتہ اگر کوئی خود ہی ہدیہ دے تو جائز ہے، اس صورت میں ثواب بھی ملے گا اور ضرورت بھی پوری

(۱) رد المحتار مع در مختار: ۲/۴۷

(۲) فتاوی اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والافتاء: ۱۵/۹۹

ہو جائے گی۔

پہلی بات: یہ کہ ہدیہ میں مال ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا ہے؟ اور تنخواہ میں بھی مال ہوتا ہے، بس نام بدلا تو ثواب خطرہ سے باہر ہو گیا، افسوس کیا ہدیہ یا تحفہ کہہ دینے سے اس کی حیثیت بدل جاتی ہے؟، ایک صحابی کو رسول اللہ ﷺ نے زکاۃ کا مال اکھٹا کرنے کے لیے عامل بنا کر بھیجا، آ کر عرض کرنے لگے کہ یہ آپ کی زکاۃ ہے جو لوگوں نے اپنے مالوں کی دی ہے، اور یہ تحائف لوگوں نے مجھے دیئے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کو تحائف وصول کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ہاں! یہ اپنی ماں کے گھر بیٹھا رہتا، پھر میں دیکھتا کہ کون اس کو تحفے دیتا، اس کو جو تحفے تحائف ملے ہیں، وہ اس لئے دیئے گئے ہیں کہ یہ عامل بن کر گیا ہے۔(۱) نیز فرمایا "هدايا العمال غلول" اگر ہمارا کوئی عامل جائے اور لوگ اس کو ہدیہ دیں، تحفہ دیں تو وہ غلول ہے، دھوکا ہے اور خیانت ہے۔(۲) رشوت کو تحفہ کہہ دینے سے اس کی حیثیت تبدیل نہیں ہوتی، اسی طرح اُجرت کو ہدیہ کہہ دینے سے حیثیت نہیں بدلتی، رسول اللہ ﷺ نے سارا کچھ واپس لے لیا، اگر اجرت لینا ناجائز ہو تو پھر ہدیہ لینا بھی ناجائز ہی ہو گا؛ کیونکہ ہدیہ لوگ ان (امام، مدرس وغیرہ) کو کیوں دیں گے؟ دینی امر کی وجہ سے ہی دیا جائے گا ناں! دینی امر کی وجہ سے اجرت ناجائز اور ہدیہ جائز!!! فرق صرف اتنا ہے کہ اجرت کا نام ہدیہ رکھ دیا ہے۔

دوسری بات: غور کرنے سے معلوم ہوا کہ جو اُجرت لینے سے منع کرتے ہیں، وہ بھی اجرت لینے کے قائل ہیں؛ لیکن نام بدل کر، نام ہدیہ رکھ دو تو پھر جائز ہے، افسوس! ظالموں نے بڑی بڑی مسجدیں اُجاڑ کے رکھ دی ہیں، اور بڑے بڑے علما کو بدنام کر رکھا ہے، یہ فتنہ کھڑا کر کے کہ ہم ایسے امام کے پیچھے نماز ہی نہیں پڑھتے جو تنخواہ لیتا ہو،

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الحیل باب احتیال العامل لیهدی إلیه، حدیث: ۲۵۹۷

(۲) مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۲۳۰۹۰

جاہلانہ پروپیگنڈہ کر کے امام، خطیب اور مؤذن کی چھٹی کروا دیتے ہیں، پھر جب کوئی صحیح امام و خطیب نہیں مل پاتا ہے تو خود ہی گمرہ رہبر بن بیٹھتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسجدیں صحیح رہبروں سے ویران ہوتی جاتی ہیں، مقصد شعوری یا غیر شعوری طور پر دین اسلام کو نقصان پہنچانا ہے۔

پانچواں اعتراض: دینی خدمات مفت میں اور گذارہ کے لئے دوسری محنت

بعض حضرات سادگی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ علما و ائمہ کرام فارغ اوقات میں کوئی اور کام بھی تو کر سکتے ہیں؟

جواب ۱:۔ اگر کوئی مدرّس، امام عموماً سات گھنٹے مدرسہ میں اور تین گھنٹہ امامت کے لیے یعنی چوبیس گھنٹوں میں سے دس گھنٹہ دین کی خدمت کے لیے وقف کرے گا اور اس پر کوئی اجرت نہیں لے گا تو وہ اپنے اہل وعیال کے لیے روزی روٹی کا بندوبست کب اور کہاں سے کرے گا؟ کس وقت یہ علماء و ائمہ دوسرے کام کریں گے؟ خواہ گیرج پر کام کرنا ہو؟ گوشت، سبزی اور دیگر اشیاء کی تجارت کرنا ہو؟

۲۔ کیا ائمہ وعلماء کے لیے کوئی ایسا پیشہ یا تجارت ہے جس میں یہ افراد دو تین گھنٹوں میں ماہانہ ہزاروں کمالیں اور ان کی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائے، اگر ہے تو براہِ کرام تمام ائمہ کرام کے لئے ایسا نفع والا بازار بتا دیں؟۔

۳۔ یہ حضرات آج کے اس مسلمہ بین الاقوامی ضابطے کو بھول جاتے ہیں کہ کسی بھی شخص کی ڈیوٹی کے اوقات کار کا تعین ضروری ہے جو عام طور پر یومیہ چھ یا آٹھ گھنٹے ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اس کے اوقات کا اس کی گھریلو ضروریات، آرام، بیوی بچوں اور تفریح وغیرہ کے لیے فارغ ہونا اس کا بنیادی انسانی حق ہے جو اس کی ضروریات زندگی میں شامل ہے، اوقات کار کے حوالہ سے آج کے مسلمہ قانون کو اگر سامنے رکھا جائے جس سے اسلام بھی انکار نہیں کرتا تو ہمارے اساتذہ، ائمہ اور دینی خدمت کے

دیگر رجال کار پہلے ہی اس دائرہ سے زیادہ وقت دے رہے ہیں اس لیے اس سے ہٹ کر ان پر کسی مزید ڈیوٹی اور کام کی ذمہ داری ڈالنا ان کی حق تلفی اور ان کے ساتھ نا انصافی کی بات ہوگی۔

۴۔گذارے کے لئے دوسرے کام کرتے ہوئے اگر دینی ذمہ داریوں میں کوتاہی ہو جائے، بچوں کی تعلیم صحیح ہونا پائے، بروقت امامت پر حاضری نہ ہو سکے تو، معاشرہ کی دینی ذمہ داریاں ادھوری رہ جائیں تو معترضین اسکا بہترین بدل بھی تیار رکھیں، چونکہ دینی امور کا نقصان بھی نا قابل تلافی نقصان ہے۔

معترض نے کتنا دین کا کام کرلیا؟

اُن سے بھی سوال ہے جو تنخواہ لینے کو دین نہیں کہتے کہ آپ نے اپنے پیشے کے ساتھ ساتھ دین کی کتنی خدمت کی ہے؟ کیا امامت، اذان اور تعلیمِ قرآن کو بلا اُجرت انجام دینے کی ذمہ داری صرف فارغین مدارس کی ہے؟ آپ جیسے حضرات کی کیا ذمہ داری ہے؟ آپ ذرا بتائیں کہ آپ نے کتنے لوگوں کو دین کی بنیادی تعلیم دی؟ کتنے افراد کو ناظرہ قرآن بالتجوید ختم کروایا؟ کتنے لوگوں کو حافظِ قرآن بنایا؟ کتنے لوگوں کو درسِ حدیث و درسِ قرآن دیا؟ اور مسجد میں کتنی مرتبہ جماعت کی امامت فرمائی ہے؟ کتنے فتاوی لکھیں ہیں؟ کتنے قضیہ حل کئے ہیں؟ اگر آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے تو آپ کس منہ سے علماء کرام کو مشورہ دیتے ہو؟ کیونکہ انصاف کی بات تو یہی تھی کہ آپ پہلے اپنی دکان، تجارت، ملازمت اور دواخانے کی مصروفیات کے ساتھ مذکورہ دینی خدمات انجام دے کر بتاتے اس کے بعد علماء کرام کو مشورہ دیتے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا ہے تو آپ بنی اسرائیل کی اس برائی کے مرتکب ہوئے ہیں جسے قرآن میں بیان کیا گیا ہے ”أتأمرون الناس بالبر وتنسون انفسکم “ کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔

چھٹواں اعتراض: علماء تجارت کرکے خدمتِ دین کیوں نہیں کرتے؟

اگر کسی کے ذہن میں یہ بات ہو کہ اسلاف جس طرح کچھ تجارت وغیرہ کرتے تھے، اس سے اپنا خرچ وغیرہ نکالتے تھے اور باقی وقت تبلیغ دین میں صرف کرتے تھے آج کے علما ویسا کیوں نہیں کرتے؟ خدمت دین بلا معاوضہ اس طرح بھی تو ممکن ہے؟

جواب: موجودہ زمانہ میں ایسی گفتگو کرنا تو آسان ہے؛ مگر درحقیقت یہ مشکل کام ہے، کیونکہ:

(ا) آج کل دینی جذبہ سرد ہو چکے ہیں، لوگوں کی ہمتیں کمزور پڑگئی ہیں اور لوگ یا تو اِس طرف یا اُس طرف کے ہو کر رہ جاتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ جو طلباء فراغت کے بعد یونیورسٹی کی ڈگری وغیرہ لیتے ہیں اور پھر کسی سرکاری کالج وغیرہ میں لیکچرار یا پروفیسر ہو جاتے ہیں تو وہ دین کا اتنا کام بھی نہیں کر پاتے جتنا ایک عام مدرسہ کا مدرس انجام دیتا ہے؛ حالانکہ ان کی بھاری تنخواہ اور فکرِ معاش سے بے فکری کی وجہ سے مدرس سے زیادہ خدمتِ دین انجام دینا ممکن ہے، یہ تو تعلیم و تعلم سے وابستہ رہنے والوں کا حال ہے۔

تنخواہ کی کمی کی وجہ سے کالج کی ملازمت

دارالعلوم دیوبند کے ایک انتہائی ممتاز مدرس حضرت شیخ الہند کے شاگرد بھی تھے، ان کو کسی کالج کی طرف سے اچھی تنخواہ پر مدرسی کی پیش کش ہوئی، انہوں نے حضرت شیخ الہند سے ذکر کیا کہ حضرت! ہم یہاں دارالعلوم میں آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے پڑھاتے ہیں، باقی وقت مطالعہ میں گزر جاتا ہے، تصنیف و تالیف یا وعظ و خطابت کے لئے وقت بہت کم ملتا ہے، خیال ہے کہ کالج میں تدریس کا وقت بہت کم ہوگا، اور باقی فارغ وقت میں تصنیف و تالیف اور دوسری دینی خدمات کا زیادہ موقع ملے گا، اس لئے یہ رجحان ہے کہ اس پیش کش کو قبول کرلیا جائے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس رائے کی مخالفت کی اور فرمایا کہ مولوی صاحب! مجھے امید نہیں ہے کہ وہاں جا کر آپ اتنی دینی خدمات بھی فارغ اوقات میں انجام دے سکیں، جتنی یہاں ہو جاتی ہیں، لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ زیادہ فرصت اور فراغت کے باوجود کام زیادہ کیوں نہیں ہو سکے گا؟ حضرت کی رائے تو نہ تھی لیکن ان کی شدید خواہش دیکھ کر اجازت دیدی، تقریباً ایک سال کے بعد چھٹیوں میں وہ دیوبند آئے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت نے سلام اور دریافت خیریت کے بعد پوچھا:

''کیوں مولوی صاحب! اس عرصے میں آپ نے کتنی تصنیف کی؟ کتنے فتوے لکھے؟ کتنے وعظ کہے؟'' ۔ یہ سن کر وہ صاحب رو پڑے اور کہا کہ حضرت حساب وکتاب کے نقطۂ نظر سے تو آپ کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی لیکن تجربے سے سمجھ میں آ گئی، واقعہ یہ ہے کہ جتنا کام دار العلوم میں عدیم الفرصتی کے باوجود ہو جاتا تھا وہاں فرصت کے باوجود اتنا نہ ہوا۔(۱)

تاجر علماء سے کتنا علمی کام ہو سکتا ہے؟

(۲) جو علماء تجارت سے وابستہ ہو جاتے ہیں اُن کا حال تو اور بھی قابل رحم ہوتا ہے۔ ''الا ماشاء اللہ'' اِنہیں تجارت سے فرصت کہاں کہ کتابوں کا بغور مطالعہ کر سکیں، اگر کوئی ایک نظر آ جاتا ہے تو وہ شذوذ ونوادرات میں سے جو مثالی واصولی نہیں کہلا سکتا، گجرات جیسا تاجرانہ شہر جس کے متعلق کہا جائے تو بعید نہیں کہ اِس کی خمیر میں تجارت شامل ہے، پھر بھی کون سے علماء علمی خدمات انجام دے پاتے ہیں؟ جو آدھا دن مدرسہ پڑھا کر آدھا دن تجارت کرنے والے یا مکمل یکسوئی سے تدریس میں لگنے والے؟ رہا دیگر علاقے جہاں عالم

(۱) البلاغ مفتی اعظم نمبر: ۱/۲۳۶

کو اچھی گاڑی پر دیکھنا پسند نہیں کرتے وہاں دُکان پر دیکھیں گے تو کیا خاک پسند کریں گے۔

علاوہ ازیں ابھی جبکہ مکمل یکسوئی کے ساتھ خدمتِ دین میں مگن احباب کی ویسی قدر کرنا نہیں ہو رہا ہے جیسی قدر ہونی چاہیئے اگر یہ حصول معاش میں بھی نظر آئیں گے تو کیا خاک قدر کی جائے گی۔

نیز علماء کی خالص خدمت دین سے حاصل کمائی ہی دیکھی نہیں جاتی، (تبھی تو اِن کی تنخواہ پر اعتراض کیا جانے لگا) کبھی منہ اٹھائے علماء ہی سے قرض مانگنے چلے آتے ہیں، جب دُکانداری پر دیکھیں گے تو مدرس کی دُکان صرف قرضوں پر ختم ہی ہو جائے گی۔

جب خالص خدمت دین میں مصروفیت کے باوجود اِن کے بتائے جانے والے مسائل پر اعتماد یا عمل دشوار گذار ہو چکا جبکہ اِن کے حلال وحرام کے مسائل میں خود اِن حضرات کا ذاتی مفاد نہیں ہے تو جب تجارت میں نظر آئیں گے تو ذاتی مفاد کا وہم عین ممکن ہے، پھر کیسے اعتماد کیا جائے گا، پھر کسی یکسو پسند عالم کو ہی تلاش کریں گے، اُس وقت کوئی نہیں ملے گا؛ کیوں کہ سب کو ہمارے مہربانوں نے مدرسہ سے اُٹھا کر تجارت میں مصروف کروا دیا ہے۔

ایسے میں بہتر یہی ہے کہ جس طرح ایک بڑے کارخانہ میں الگ الگ شعبے ہوتے ہیں اور ہر شعبہ اپنا اپنا مخصوص کام انجام دیتا ہے؛ اور وہ مکمل طور پر فیکٹری کے مقاصد ہی پورے کرنے میں لگا رہتا ہے، اسی طرح ہر ایک دین کی وہ خدمت انجام دے رہا ہے جو اس کیلئے خدا نے میسر کیا ہے، علماء تبلیغ دین، اشاعت دین اور حفاظت دین کا فریضہ انجام دیں، مالدار حضرات اپنے مال سے ان کی اعانت کریں جو خدمت دین کی ایک شکل ہے، اس طرح ہر ایک سے جتنا جو کچھ ہو سکے دین کی خدمت انجام دے۔

ماضی کے علماء تاجرین پر قیاس کرنا درست نہیں ہے

بعض مرتبہ وہم ہوتا ہے کہ اگر تجارت کے ساتھ تدریس دشوار ہے تو ماضی کے علماء

نے کیسے کیا؟ بلا شبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین میں سے ایسے بہت سے افراد گذرے ہیں جو تجارت کے ساتھ درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے ہیں؛ لیکن موجودہ دور کو اُس زمانے پر قیاس کرنا سراسر ظلم ہے، جس کو تھوڑی بھی عقل ہے زمانے کے فرق کو سمجھ سکتا ہے، تجارت کی مشغولیت سے لوگ گھر کو وقت نہیں دے پار ہے ہیں، تجارت کی وجہ سے لوگ فرض نماز کے لئے وقت نہیں دے پاتے ہیں، علماء کرام تجارت، گھر، مسجد، مدرسہ سب کو وقت دیں؟

نیز ضروریاتِ زندگی پہلے کی طرح مختصر نہیں رہیں، پہلے ضروریات زندگی بہت مختصر ہوتے تھے، رُوکھا سُوکھا کھانا، رہنے کے لیے معمولی گھر، پہننے کے لئے بے تکلف لباس، ہر چیز بہت سستی، جبکہ موجودہ دور مادی دور کا طرز زندگی اور رہائش کا معیار بہت بلند ہو چکا ہے، آج کل کی ضروریات دن بدن مہنگائی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہیں، علاج سے موت سستی لگنے لگی ہے، تعلیم سے جہالت میں عافیت محسوس ہوتی ہے۔

حضرت تھانویؒ کی رائے

موجودہ وقریب کے علماء نے موجودہ دور کے علماء کو کیا ترغیب دی ہے؟ وہ بھی دیکھ لیں؛ کیونکہ زمانہ کی تبدیلی سے بدلنے والے تقاضوں کو یہ حضرات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

☆ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں" تجارت سنت ہے؛ لیکن یہ بتاؤ! نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کے بعد کتنی تجارت کی" اور ایک جگہ فرماتے ہیں: ایک بوڑھیا مسئلہ پوچھنے کے لئے آئی، میں نے اس کو جواب دیا تو کہنے لگی: یہ جواب تو فلاں مولوی صاحب نے بھی دیا تھا؛ لیکن وہ تاجر ہیں، اس لئے میں سوچ رہی تھی کہ ان کے جواب دینے میں کوئی ذاتی تجارتی مصلحت ہو۔

اس کے علاوہ فرماتے ہیں کہ: ایک شخص دو طرف پورا متوجہ نہیں ہوسکتا؛ اگر

ملازم سرکار دوسرے کا کام کرے گا تو خود سرکاری کام میں خلل واقع ہوگا: اس لئے اس کو اجازت نہیں کہ بحالت ملازمت دوسرا کام کرے"۔

پھر فرماتے ہیں: علماء کے کسب معاش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ: ایک مولوی صاحب ایک دینی مدرسہ میں ملازم تھے: مگر لکڑیوں کی تجارت کرتے تھے، خود قصہ بیان کرتے ہیں کہ مدرسہ کے وقت میں طلباء کو پڑھانے بیٹھے ہیں کہ گاہک آگیا اور اس نے لکڑی کا سودا کرنا چاہا، پس مولوی صاحب کشمکش میں پڑ گئے کہ اگر اٹھتے ہیں تو مدرسہ کا حرج اور نہیں اٹھتے ہیں تو خریدار لوٹ جاتا ہے، مجبوراً اس سے کہتے ہیں کہ بھائی ابھی اٹھتا ہوں ذرا ٹھہر و اس میں تھوڑا جھوٹ بھی ہوتا ہے۔

غرض ان کا دل بٹ جاتا سبق میں کچھ سے کچھ بیان کر جاتے، پہلے تو طالب علموں کو ہنسی خوشی بتلا رہے تھے، اب دل دوسری طرف ہوگیا، طلباء کچھ پوچھتے ہیں اور پوچھنے کے سبب اٹھنے میں دیر ہوتی ہے تو ان پر جھنجھلاتے ہیں، غصہ ہوتے ہیں، علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہی اثر ہوتا ہے کہ دین کا کام پوری طرح نہیں کر سکتے۔(۱)

شیخ الحدیث مولانا محمد صاحبؒ کی رائے

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد صاحبؒ علماء کے تجارت وغیرہ دنیا کے مشاغل سے کنارہ کش رہنے میں عافیت کے متعلق فرماتے ہیں:

"علمی اشتغال چاہے علوم ظاہری ہوں یا علوم باطنہ یقیناً بہت اہم ہے اور ایسے لوگوں کے لئے یقیناً کسی دوسری چیز میں مشغول ہونا ہرگز نہ چاہیے اور محض نادانوں، احمقوں کے طعن و تشنیع کے خوف سے اس اہم مشغلہ کے ساتھ کمائی وغیرہ کی طرف لگنا جاہلوں کے طعن و تشنیع سے یہ اہل علم بچے نہ انبیائے اکرام بچے"

(۱) مسنون اصول تجارت: ۲۶۸

آج کل یہ وبا بہت عام ہوتی جارہی ہے کہ اہل علم کو اپنا گزر چلانے کے لئے کسی صنعت وحرفت کا سیکھنا ضروری ہے اور اہل علم بھی دنیاداروں کے طعن وتشنیع سے بددل ہوکر اس کی اہمیت کو محسوس کررہے ہیں اور مدارس عربیہ دینیہ میں یہ سلسلے بھی جاری ہورہے ہیں: لیکن یہ علم کو بہت زیادہ نقصان دینے والی چیز ہے، اس میں اسلام کے نمونے سامنے رکھے جاتے ہیں جنہوں نے اپنے معاش کے لئے تجارت وحرفت وغیرہ کے مشاغل اختیار کرتے ہوئے دین کی اور علم کی خدمت کی اور یقیناً اگر اللہ جل شانہ توفیق عطاء فرمائے تو یہ طریقہ بہترین طریقہ ہے؛ مگر ہم لوگوں کے قلوب اور ہمارے قوی اور ہمارے احوال نہ تو اس کے متحمل ہیں کہ ہم لوگ دو کام بیک وقت کرسکیں اور نہ ہماری طمع نفس اور حب دنیا اس کی گنجائش دیتی ہے کہ مال کی بڑھوتری کے اسباب پیدا ہونے کے باوجود اللہ کے واسطے دین کی خاطر علم کی خاطر ہم اپنے اوقات کو دنیا کے کمانے کے مشاغل سے زیادہ سے زیادہ فارغ کرسکیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں دونوں کام شروع کئے اور آخر میں علمی مشغلہ پر دنیا کی کمائی اور طلب غالب آ گئی جس کے بارہا تجربے ہوچکے ہیں۔

مفتی اعظم مفتی شفیع صاحبؒ کی رائے

مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: علماء تجارت وخدمت دین کو جمع کریں تو نتیجہ ارذل کے تابع ہوتا ہے (جیسے دودھ اور گندا پانی جمع ہوجائے تو گندا پانی ہی غالب رہتا ہے) پھر تجارت ہی خدمت دین پر غالب آجاتی ہے۔

قاری امیر الحسن صاحبؒ کی رائے

حضرت قاری امیر الحسن صاحبؒ، خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ سے ہمارے ایک مدرس دوست نے مشورہ کیا کہ وہ مدرسہ چھوڑ کر یا ساتھ ساتھ کچھ تجارت

کرنا چاہتے ہیں تو حضرت نے جواب دیا کہ ''یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ سونے چاندی کو چھوڑ کر کوئی گارے مٹی کا کاروبار کرے''۔

لوگ کہتے ہیں کہ علماء کا کوئی ذریعہ معاش ہونا چاہئے، لیکن طبیعتیں کمزور ہوگئیں، صفات مضمحل ہوگئے، تجارت غالب آجاتی ہے، خدمت دین باقی نہیں رہتی، یہی بات تقریباً فضائل تجارت میں اسی مضمون کا اکابر کی زندگیوں کی روشنی میں دیکھنا ہے۔(۱)

تنخواہ لینے سے متعلق مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

☆ حضرت مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو جب ندوۃ العلماء کی تدریس ونظامت پیش کش کی گئی تو مشاہرہ لینے نہ لینے سے متعلق کافی تشویش ہوئی تو قلبی اطمینان کے لئے حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحبؒ نے فرمایا: مولوی صاحب! ضرور قبول کرلو! اور مشاہرہ بھی لے لو اور نیت کرلو کہ چار چھ مہینہ وصول کرنے کے بعد چھوڑ دوں گا، اور پھر بغیر مشاہرہ کے ہی پڑھاؤں گا، اگر شروع سے ہی مشاہرہ نہ لو گے تو طلبہ بھی قدر سے تمھاری بات نہیں سنیں گے، اور مدرسہ والے سمجھیں گے ہم نے اس پر احسان کیا ہے کہ درس حدیث کے لئے مسند پر بٹھا دیا۔

تبلیغی احباب کی محنت پر قیاس کرنا غیر شرعی ہے

بعض لوگ تبلیغی احباب کے کام پر قیاس کرتے ہیں کہ وہ اپنا مال واپنی جان لگا کر علماء سے زیادہ دین کا کام کرتے ہیں تو علماء وائمہ کرام کیوں نہیں کرسکتے؟

جواب ۱:۔ کیا تبلیغی محنت میں علماء نہیں لگے ہیں؟ پھر علماء سے یہ سوال کیسا؟ یعنی علما کا ایک طبقہ اپنی جان اور اپنا مال لگا کر دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔

۲۔ تبلیغ اور تدریس کی نوعیت یکساں ہے یا الگ الگ ہے؟ جتنا وقت تبلیغ میں

---

(۱) مسنون اصولِ تجارت: ۲۷۱

لگتا ہے اُتنا ہی وقت تدریس میں لگتا ہے یا اُس سے زیادہ وقت لگتا ہے؟ آج تک مرکز کے امام کوئی تبلیغی صاحب اپنی اولاد کو بلا معاوضہ تدریس، امامت، اور مکاتب وغیرہ میں کیوں نہیں لگاے؟ اگر لگائے ہیں تو بہت قابل تعریف و قدر کی بات ہے۔

۳۔تبلیغ کا کام اوقات معاش میں ہوتا ہے یا صبح و شام ہوتا ہے؟ تبلیغی کام اوقات کسب میں نہیں ہوتا، جبکہ تدریسی کام اوقاتِ کسب میں ہوتا ہے، اوقاتِ کسب میں بلا معاوضہ خدمت کر کے جب کسب و کمائی کا وقت گذر جائے تو کمانے کا نظام بنانا کس کے بس میں ہے؟۔

۴۔اپنی جان اور اپنا مال کے علاوہ کیا تبلیغ میں اُمّت کی جان اور اُمّت مال قبول نہیں کیا جاتا؟ جماعتوں کی نصرت، مقامی احباب کی سواریاں وغیرہ کس کا مال ہے؟ بڑے بڑے اجتماعات کے لئے چندہ ''مصافحہ'' کے نام پر نہیں ہوتا؟ مرکز کی ہفتہ واری خدمت حلقوں کے ذمہ طے نہیں کی جاتی؟ یہ سب اپنی جان اور اپنا مال ہے یا اُمّت کی جان اور اُمت کا مال بھی ہے؟

۵۔ائمہ کرام جس طرح پانچ وقت پابندی سے ایک ہی مسجد میں اقامت سے پہلے نماز کو پہنچتے ہیں اس طرح کوئی پرُانے سے پرُانے تبلیغی صاحب ہیں جو امام کی طرح پابند ہوں؟ ہیں تو ایسے مقدس شخصیت کی بنیتِ ثواب زیارت کر لینا چاہئے؛ مگر ایسے شخصیات عنقاء ہیں؛ کیونکہ اُن پر نماز پڑھانا (امامت) ذمہ داری کے طور پر نہیں ہے جبکہ امام پر ذمہ داری ہے، اِس ذمہ داری کے ساتھ تجارتی اسفار، تجارتی ذمہ داریوں کا بوجھ راحت بخش ہے یا زحمت رساں؟ اور کیا ہر جگہ ہر امام کو مارکٹ میں چلنے والی تجارت میسّر ہو جانا آسان ہے؟

۷۔جس طرح گیارہ ماہ کما کر ایک چلہ اللہ کے راستہ میں جاتے ہیں، مدرسین عظام و ائمہ کرام بھی گیارہ ماہ کما کر ایک چلہ تدریس و امامت کر لیں گے، اور وہ ایک

چلہ بغیر معاوضہ کے اپنی جان اوراپنا مال لگا کر تدریس وامامت کا فریضہ انجام دیں گے تو کیا اس شکل پر ہم لوگ راضی ہیں؟ کیسی حماقت ہے! جب دونوں کا میدان الگ الگ ہے تو کیسے قیاس کیا جائے گا؟

کیا یہ اکابر دین کا کام نہیں کئے؟

بعض نادان دوستوں کی سوچ ہے کہ پیسہ لے کر امامت کرنا خدمتِ دین نہیں، ہم اپنی جان ومال سے دین کا کام کرتے ہیں اور علما کرام دین کے کام پر دنیا حاصل کر لیتے ہیں، اِس نظریہ کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو مگر ہے یہ غلط نظریہ، حضرت جی مولانا الیاس صاحبؒ مظاہر العلوم میں پڑھاتے ہوئے تنخواہ لیتے تھے، حضرت جی الیاس صاحبؒ کے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ بھی تنخواہ لیتے تھے۔

حضرت نانوتوی آٹھ/ دس روپے کی اُجرت پر مطبع میرٹھ میں کام کرتے تھے، اُس زمانے میں اتنی تنخواہ میں دودھ دینے والی ایک بھینس مل جاتی تھی، اب ایک متوسط بھینس کی قیمت چالیس پینتالیس ہزار روپے ہے، یعنی متوسط تنخواہ چالیس / پینتالیس ہزار روپے ہے۔

شیخ الہندؒ کی تنخواہ پچھتر روپے تھی، پچاس روپیہ میں گھر کا خرچ نکل جاتا تھا، پچیس روپے ہر ماہ دارالعلوم کو واپس کر دیتے تھے، یعنی اتنی تنخواہ کے بچی ہوئی کارِخیر میں خرچ کی جاسکے۔(۱)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ کانپور سے علیحدگی کے وقت پچاس روپے تھی، جب حضرت کی ملکیت پانچ سو روپے کی ہوگئی تھی تو والد ماجد کو لکھا کہ اب مجھ پر حج فرض ہو چکا ،یعنی دس ماہ کی تنخواہ سے حج فرض ہو جایا کرتے تھے۔(۲)

---

(۱) مستفاد: دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، حضرت گیلانی

(۲) مستفاد: اشرف السوانح

حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب کی تنخواہ ڈھائی سو روپے تھی، حج کرنے گئے تو اس کا کل خرچ پندرہ سو روپیہ آیا تھا، ظاہر ہے کہ یہ تنخواہیں کم نہیں ہیں؟ اس لیے اکابر کی طرف تنخواہ نہ لینا قلت تنخواہ کا انتساب بالکل درست نہیں ہے۔

اکابرین کی ایک قلیل جماعت ایسی گذری ہے جو بلا معاوضہ دینی خدمات انجام دیتی تھی، جبکہ بامعاوضہ خدمت کرنے والوں کی تعداد لاتعداد ہے، تو کیا ان برگزیدہ شخصیات پر بھی الزام لگائیں گے کہ یہ بھی دین کا کام نہیں کرتے تھے؟ یاد رہے تنخواہ لینا نہ جرم ہے اور نہ اخلاص کے منافی ہے، اور مفت میں کام کرنا مخلص ہونے کی کوئی دلیل ہے، ورنہ سخی، شہید، عالم جو جہنم میں ڈالے جائیں گے وہ مفت میں کام کئے تھے؛ مگر اندر ریا تھا، پتہ چلا تنخواہ لینے والا مخلص اور مفت میں کام کرنے والا ریاکار ہوسکتا ہے۔

دینی خدمات بلا معاوضہ کرنے کا غلط تصوّر ختم کریں

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں" ہمارے ہاں یہ غلط تصور رواج پا گیا ہے کہ دینی خدمات کسی معاوضہ کے بغیر سرانجام دینی چاہئیں اور کسی دینی خدمت پر وظیفہ یا تنخواہ کا تقاضا کرنا ثواب اور اجر سے محرومی کا باعث بن جاتا ہے، بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اِرشاد گرامی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کوئی خدمت ان کے سپرد کی اور اس کی انجام دہی کے بعد آنحضرت ﷺ نے انہیں کچھ حق الخدمت پیش کیا جو انہوں نے یہ کہہ کر قبول کرنے میں تامل کیا کہ میں نے تو یہ خدمت اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے سرانجام دی ہے اور میری مالی حالت بہتر ہے مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ بات قبول نہیں کی اور فرمایا کہ "خذہ و تمولہ" اس کو وصول کرو اور اپنے مال میں شامل کرو، اس کے بعد اگر تمہاری مرضی ہو تو صدقہ کردو، مطلب یہ ہے کہ کسی دینی خدمت پر حق الخدمت ادا کرنا ضروری ہے، اسے وصول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے

اور اس سے دینی خدمت کا ثواب و اجر ختم نہیں ہو جاتا''۔(۱)

تنخواہ لینا رخصت ہے یا عزیمت ہے؟

تنخواہ لینے وہ نہ لینے کا مسئلہ فی نفسہ نہ عزیمت نہ اور نہ ہی رخصت، بل کہ ہر شخص کی اپنی حالت پر موقوف ہے، کوئی صاحب حیثیت ہے تو اس کے لئے تنخواہ لینا رخصت ہے، اور اگر اسی پر گذارہ ہے تو تنخواہ لینا ہی عزیمت ہے، البتہ اس عہدہ اور منصب کو ''تکثیر دولت'' کا بہر حال ذریعہ نہ بنائے گا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے یزید بن ابی مالکؒ اور حارث بن ابی محمدؒ کو دیہاتوں میں حدیث وسنت کی تعلیم کے لیے مقرر کیا اور ان کی تنخواہیں بھی مقرر کردیں، حضرت یزیدؒ نے تو تنخواہ قبول کی مگر حارثؒ نے لینے سے معذرت کردی کہ اللہ نے جو علم مجھے دیا ہے، اس کا معاوضہ میں نہیں لوں گا، جب عمر بن عبد العزیزؒ کو اس کا پتہ چلا تو فرمایا: یزید نے جو کیا، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، ہاں! خدا کرے حارث جیسے ہم میں اور زیادہ پیدا ہوں۔

> ''وبعث عمر بن عبد العزيز يزيد بن أبي مالك والحارث ابن محمد إلى البادية أن يعلما الناس السنة، وأجرى عليهم الرزق، فقبل يزيد ولم يقبل الحارث، وقال:ما كنت لآخذ على علم علمنيه الله أجرًا، فذكر ذلك لعمر بن عبد العزيز فقال :مانعلم بما صنع يزيد بأسًا وأكثر الله فينا مثل الحارث''(۲)

صدیق اکبرؓ کا تنخواہ واپس کرنے کا عمل

شروع میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہونے کے باوجود کاروبار کر کے اپنا اور بال

(۱) روزنامہ اسلام، لاہور، ۱۵ جون ۲۰۱۸ء

(۲) الفقیہ والمتفقہ، الخطیب البغدادی: ۳۴۹

بچوں کی ضروریات پوری کرتے تھے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے وظیفہ مقرر کیا؛ لیکن اس کے باوجود بوقت وفات انہوں نے یہ سب کچھ بیت المال میں جمع کرادیا، یہ بھی دراصل بات تقوے کی ہے، فتوے کی نہیں، اسی لئے دیگر خلفائے راشدین سے تنخواہ واپس کرنا ثابت نہیں ہے۔

"وكان الذي فرضوه له في كل سنة ستة آلاف درهم فلما حضرته الوفاة قال ردوا ماعندنا من مال المسلمين فإني لا اصيب من هذا المال شيئا وان ارضي التي بمكان كذا وكذا للمسلمين بما اصيب من اموالهم فدفع ذلك لعمر"(۱)

علاوہ ازیں اس سے اتنا تو ثابت ہوگیا کہ صدیق اکبرؓ کی تنخواہ بیت المال سے مقرر کی گئی تھی، اور زندگی کا ایک عرصہ تنخواہ پر گذرا، اگر یہ جائز نہ ہوتا تو صحابہ کرام کیوں بیت المال سے وظیفہ مقرر کرتے؟۔

"قالت عائشه:ياكل الوصي بقدر عمالته وأكل أبوبكر وعمر"(۲)

تنخواہ نہ لینے والے اسلاف کا عمل حجت نہیں بن سکتا

دنیا کو کتاب وسنت کی رہنمائی مہیا کرنا ایک دینی فریضہ ہے، اس لیے یہ فتویٰ دیا گیا کہ ان کا بھی معاوضہ نہیں لینا چاہئے! چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔

"عن القاسم بن عبدالرحمن أن عمر كره أن يؤخذ عن القضاء رزق وصاحب مغنمهم"(۳)

(۱) تاريخ الامم والملوك تاريخ الطبري السنة الثالثة للهجرة:۵۶۴

(۲) عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری: ۵۹/۱۴

(۳) مصنف عبدالرزاق، حدیث ۱۵۲۸۱

حضرت مسروق بھی قضا کا معاوضہ نہیں لیتے تھے۔

"أنه كان لايأخذ على القضاء رزقا"(۱)

حضرت قاسم بن عبدالرحمن کا بھی یہی مسلک تھا۔

قال القاسم"أَرْبَعٌ لَا يُؤْخَذُ عَلَيْهِنَّ رِزْقٌ :الْقَضَاءُ، وَالْأَذَانُ، وَالْمُقَاسِمُ قَالَ :وَأُرَاهُ ذَكَرَ الْقُرْآنَ"(۲)

منصور بن المعتمر اس شخص سے تو کوئی خدمت بھی نہیں لیتے تھے جو کسی ضرورت اور لالچ کے ماتحت اس کے پاس آتا تھا۔

"كان منصور لايستعين بأحد يختلف اليه في حاجته كذا في التهذيب لابن حجر"

حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں، فہم قرآن کے لیے جو ملکہ عطا ہوا تھا وہ ابوجعفر (منصور عباسی) سے ایک تھیلی قبول کرنے پر چھن گیا، پھر میں نے اللہ سے بخشش کی دعا کی۔

"كنت قد أوتيت فهم القران فلما قبلت الصرة أبي جعفر سلبته فنسائل الله تعالى المسامحة"(۳)

ا۔ کیونکہ جہاں ان اکابرین کا عمل ہے وہیں دیگر اکابرین عمل بھی موجود ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہؒ نے اپنی کتاب "المغنی" ایک مستقل فصل قائم کی ہے جس کا عنوان ہی ہے " فصل :ويجوز للقاضي أخذ الرزق، ورخص فيه شريح، وابن سيرين، والشافعي ، وأكثر أهل العلم" اس کے تحت میں صحابہ کرام کا عمل اور تابعین کا عمل نقل فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو تنخواہ پر مسند قضاء پر بھیجا، حضرت شریحؒ کو

---

(۱) مصنف عبدالرزاق

(۲) مصنف عبدالرزاق، حدیث: ۱۵۲۸۵

(۳) تذكرة السامع والمتكلم: ۱۹

ماہانہ سو درھم تنخواہ متعین تھی، اور حضرت عمار، عثمان بن حنیف اور ابن مسعودؓ کو بھی کوفہ بھیجا اور یومیہ ایک بکری تنخواہ متعین فرمائی جس آدھی حضرت عمارؓ کو، بقیہ میں دونوں صحابہ کرام شریک ہو جائیں۔''

''وروي عن عمر رضي الله عنه أنه استعمل زيد بن ثابت على القضاء، وفرض له رزقا. ورزق شريحا في كل شهر مائة درهم. وبعث إلى الكوفة عمارا وعثمان بن حنيف وابن مسعود، ورزقهم كل يوم شاة; نصفها لعمار ونصفها لابن مسعود وعثمان، وكان ابن مسعود قاضيهم ومعلمهم. وكتب إلى معاذ بن جبل، وأبي عبيدة، حين بعثهما إلى الشام، أن انظرا رجالا من صالحي من قبلكم، فاستعملوهم على القضاء، وأوسعوا عليهم، وارزقوهم، واكفوهم من مال الله''

....''وقال أصحاب الشافعي :إن لم يكن متعينا جاز له أخذ الرزق عليه، وإن تعين لم يجز إلا مع الحاجة. والصحيح جواز أخذ الرزق عليه بكل حال; لأن أبا بكر رضي الله عنه لما ولي الخلافة، فرضوا له الرزق كل يوم درهمين. ولما ذكرناه من أن عمر رزق زيدا وشريحا وابن مسعود، وأمر بفرض الرزق لمن تولى من القضاة، ولأن بالناس حاجة إليه، ولو لم يجز فرض الرزق لتعطل، وضاعت الحقوق''(۱)

۲۔ ابنِ طولون رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

مصر کے فرماں رَوا ابن طولون کی عادت میں شامل تھا کہ اپنے ائمہ کرام کی

(۱) المغنی لابن قدامہ: ۱۰/۹۱

خبر گیری کرنا، ایک دن (قرأت سن کر گھر لوٹے تو) اپنے مصاحب سے کہنے لگے: یہ دینار لے جاؤ اور فلاں مسجد کے امام صاحب کو دے آؤ! مصاحب کہتا ہے: میں دینار لے کر امام صاحب کے ہاں پہنچا، تو ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ امام صاحب میرے ساتھ گھل مِل گئے اور اپنے دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے: "میری بیوی کے ہاں ولادت ہونے والی ہے، لیکن میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں کہ اُس کے لیے ضروری سامان لاسکوں، اسی پریشانی میں آج نماز پڑھاتے وقت بھی کئی غلطیاں ہوگئیں۔" مصاحب کہتا ہے میں نے آ کر ابن طولون کو ساری بات بتائی، تو کہنے لگے: امام صاحب نے سچ کہا؛ میں آج ان کی قرات سننے کے لیے ٹھہرا تو وہ بہت غلطیاں کر رہے تھے، میں نے سمجھ لیا ان کا دل کسی اور طرف مشغول ہے، اسی لیے رقم بھجوائی۔(۱)

مامون رشید کا واقعہ

ہارون الرشید نے مامون (۲) کو قرآن پاک پڑھانے کے لئے تین استاذ کسائی،

(۱) کتاب اَلأذکیاء، لابن جوزی، الباب الحادی عشر: ۵۷، ط دار الفکر بیروت

(۲) بنو امیہ کے بعد مسلمانوں کی قیادت بنی عباس کی ہاتھ آئی، ان کا سلسلہ نسب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے جو حضرت عبد المطلب کے صاجنرادے تھے، ان کی اولاد میں سے ایک خلیفہ مہدی گزرے ہیں، انہوں نے مرنے سے پہلے وصیت کی کہ ان کی موت کے بعد بڑا بیٹا ابو محمد موسیٰ الہادی نظام خلافت سنبھالے اور اس کے بعد دوسرا بیٹا ہارون الرشید۔ لیکن ہادی اپنے بعد ہارون الرشید کو خلافت نہیں دینا چاہتا تھا، اس نے بدنیتی سے بھائی کو خلافت سے محروم کرنا چاہا، ہارون رشید خانہ جنگی سے بچنا چاہتا تھا، ممکن ہے اس کا بھائی اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا لیکن موت نے اسے آن دبوچا۔ یہ ربیع الاول ۱۷۰ھ کی ایک رات کا ذکر ہے جب ہادی نے وفات پائی، اس وقت ہارون الرشید گہری نیند سو رہا تھا، وزیر اعظم یحییٰ نے اسے جگا کر خلیفہ بننے کی خوشخبری سنائی، ابھی وہ آپس میں گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ہارون الرشید کی خاص کنیز نے اسے دوسری خوشخبری سنائی کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ یہی وہ خوش نصیب شہزادہ ہے جو تاریخ میں مامون الرشید کے نام سے مشہور ہوا۔

نحوی اور یزیدی مقرر کیئے، یہ تینوں اسلامی تاریخ کے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں، استاد کسائی اپنے شاگرد مامون سے سبق سن رہے تھے، وہ سورۂ صف کی ایک آیت تلاوت کر رہا تھا "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ" جس کا مطلب ہے "اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں" یہ آیت سنتے ہوئے اچانک استاد کی نظر شاگرد کی طرف اٹھ گئی، استاد کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو شاگرد نے آیت دہرائی لیکن وہ جانتا تھا کہ اس نے درست پڑھی ہے، تھوڑی دیر بعد استاد چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ خاصی دیر تک سوچتا رہا کہ استاد نے اس کی طرف کیوں دیکھا؟

استاد کسائی کا طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ وہ شاگرد کو پڑھنے کو کہتے اور خود سر جھکا کر سبق سنتے رہتے، جب شاگرد پڑھنے میں غلطی کرتا تو استاد کی نظر اٹھ جاتی، یہ دیکھ کر وہ اپنی اصلاح کر لیتا۔

استاذ کے جانے کے بعد شاگرد اپنے باپ کی خدمت میں حاضر ہوا، کیا آپ جانتے ہیں وہ کون تھا؟ شہزادہ مامون الرشید جو اپنے والد عباسی خلیفہ ہارون رشید کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شہزادہ نے عرض کی، ابان جان! کیا آپ نے استاذ کسائی کو کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا، اگر کیا تھا تو اسے پورا فرمائیے! ہاں! انہوں نے قاریوں کے لئے کچھ وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی تھی، کیا انہوں نے تم سے کچھ کہا؟ خلیفہ نے پوچھا، جی نہیں، جواب ملا۔ پھر تمہیں کس طرح پتا چلا؟ خلیفہ ہارون رشید نے حیران ہو کر دریافت کیا۔ شہزادہ مامون نے تب آیت پڑھنے کا ماجرا بیان کیا، خلیفہ کم سن شہزادہ کی ذہانت پر حیران بھی ہوا اور خوش بھی، بات ہی ایسی تھی کیوں کہ اس وقت شہزادہ مامون کی عمر صرف پانچ برس تھی۔(۱)

کیا زمانہ تھا کہ قرآت سن کر اور ایک نظر سے حالات کا جائزہ ہو جاتا تھا آج یہ

---

(۱) خطبات رحیمی: ۴/ ۱۰۳

حالت ہوئی گئی ہے کہ کئی مرتبہ صاف الفاظ میں بولنے کے بعد بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

۳۔ یہ سب باتیں، تقویٰ، احتیاط اور خشیت الٰہی کی ہیں، ورنہ کئی دلائل سے ثابت ہو چکا کہ تنخواہ لینا ایک عمومی ضرورت ہے، اگر تنخواہ کے معاملہ کو ہٹا دیا جائے تو قراء، مؤذن، ائمہ اور معلمین کسی عظیم ابتلاء اور آزمائش میں پڑ جائیں گے، بھوکوں مریں یا کتاب وسنت اور دوسرے دینی فرائض کی ترویج اور نشر و اشاعت کا سرے سے سلسلہ ہی رک جائے۔۔۔ ہمارے نزدیک خدمت کا معاوضہ قبول کرنے سے کہیں زیادہ یہ صورت سنگین ہے، اس لیے اس تلخی کو قبول کرنا ہی اب دین ہے۔"الضرورات تبیح المحظورات"۔

کچھ آپ سے بھی مطلوب ہے

جو لوگ امامت و تدریس کو مفت کرنے کے قائل ہیں ان سے سوال ہے کہ وہ لوگ اپنے پیشے کے ساتھ دین کی کتنی خدمات کرتے ہیں؟ امامت، اذان اور تعلیمِ قرآن کو بلا اُجرت انجام دینے کی ذمہ داری صرف فارغین مدارس کی ہے؟

معترضین کی ذمہ داری کیا صرف اعتراض کرنا ہی ہے؟

یہ حضرات کتنے مریضوں کا مفت علاج کرتے ہیں؟

کتنی بیواؤں کا سہارا بنتے ہیں؟

کتنے غریب کے کیس مفت لڑتے ہیں؟

کتنے غریبوں کو مفت جوڑے اپنے کپڑے کی دوکان سے دیتے ہیں؟

کتنے غریبوں کو مفت ماہانہ راشن بھیجتے ہیں؟

کتنے غریبوں کی اسکول فیس ادا کرتے ہیں؟

کتنے لوگوں کو دین کی بنیادی تعلیم دیتے ہیں؟

کتنے افراد کو ناظرہ قرآن بالتجوید پڑھاتے ہیں؟

کتنے لوگوں کو حافظِ قرآن بناتے ہیں؟
کتنے لوگوں کو درسِ حدیث و درسِ قرآن دیتے ہیں؟
کتنی مرتبہ جماعت کی امامت کراتے ہیں؟
کتنے مکاتب کا مالیہ سنبھالتے ہیں؟
کتنے بے قصور قیدیوں کو رہا کروانے کی کوشش میں ہیں؟
کتنی مرتد بیٹیوں کو واپس لانے میں کامیاب ہو گئے؟
کتنے گرتے مدارس کو سہارا دیا ہے؟
کتنی تفسیر و حدیث کی کتابیں لکھے ہیں؟
کتنے طلبہ کو عالم و حافظ بنائے ہیں؟

اگر یہ سب نہیں ہوا اور نہ ان میں سے کچھ بھی ہوا تو کس منہ سے علماء کرام کو مشورہ دیں گے؟ پہلے اپنی مصروفیات کے ساتھ مذکورہ دینی خدمات بھی انجام دیں، اگر نہیں کر سکتے تو اپنی عزت خود کرنا سیکھ لیں۔

دینی امور کی تنخواہ کے عدم جواز کے دلائل کی حقیقت

پہلی دلیل: تحفے میں کمان والی حدیث کی حقیقت

سیدنا عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں: ''میں نے اہل صفہ کے کئی لوگوں کو کتابت (لکھائی) اور قرآن کریم کی تعلیم دی، ان میں سے ایک شخص نے مجھے ایک کمان تحفے میں دی، میں نے کہا: یہ کوئی مال تو ہے نہیں، پھر میں اس کے ذریعے اللہ عزوجل کے راستے میں تیراندازی کروں گا، میں ضرور رسولِ اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اس بارے میں استفسار کروں گا، چنانچہ میں آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! ان لوگوں میں سے ایک آدمی نے مجھے ایک کمان تحفے میں دی ہے، جنہیں میں کتاب اور قرآن کی تعلیم دیتا تھا، یہ کوئی مال تو ہے نہیں، پھر میں اس کے ذریعے اللہ کے راستے میں تیراندازی کروں گا، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم چاہتے ہو کہ آگ کا ایک طوق تم کو پہنایا جائے تو اسے قبول کرلیں۔

''عَلَّمْتُ نَاسًا مِّنْ أَهلِ الصُّفَّةِ الْكِتَابِ، وَالْقُرْآنَ، فَأَهْدٰى إِلَيَّ رَجُلٌ مِنْهُمْ قَوْسًا، فَقُلْتُ: لَيْسَتْ بِمَالٍ وَّأَرْمِي عَنْهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، لَآتِيَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَلَأَسْأَلَنَّهُ، فَأَتَيْتُهُ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، رَجُلٌ أَهْدٰى إِلَيَّ قَوْسًا مِّمَّنْ كُنْتُ أُعَلِّمُهُ الْكِتَابِ، وَالْقُرْآنَ، وَلَيْسَتْ بِمَالٍ، وَأَرْمِي عَنْهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ قَالَ: 'إِنْ كُنْتَ تُحِبُّ أَنْ تُطَوَّقَ طَوْقًا مِّنْ نَّارٍ، فَاقْبَلْهَا''۔(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم قرآن پر اُجرت لینا جائز نہیں ہے۔

(۱) سنن أبي داود، کتاب البیوع، أبواب الاجارة، في کسب المعلّم، حدیث: ۳۴۱۶، امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند کو ''صحیح'' قرار دیا ہے

پہلا جواب: حدیث اہلِ صفّہ کے ساتھ خاص ہے

حدیث کے ابتدائے جملوں میں غور کریں، سیدنا عُبادہ رضی اللہ عنہ مہاجر صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''میں نے اہلِ صفہ کو سکھایا'' ظاہر ہے کہ اصحابِ صفہ بہت مفلس تھے، پہلے ہی دوسرے صحابہ کرام کے صدقات وخیرات پر گزارا کرتے تھے، ایسے مفلس طالب علموں سے کچھ لینا کیسے درست کہا جاسکتا ہے؟ پتہ چلا یہاں تعلیم قرآن کی وجہ سے ممانعت نہیں تھی، چنانچہ سیدنا عُبادہ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں اس تحفے کو قبول کرنے کے حوالے سے شک کیوں آیا کہ پہلے نبی ﷺ سے پوچھ لیتے ہیں؟ اس کا سبب خاص اصحابِ صفہ سے تعلیم کے عوض مال لینے سے ممانعت تھی، ورنہ تحائف تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھی پیش کیے جاتے تھے اور آپ ﷺ انہیں قبول فرماتے تھے، اُس کے باوجود سیدنا عُبادہ ؓ کا تحفہ قبول کرنے میں تامل کرنا بتارہا ہے کہ یہاں کوئی مخصوص وجہ تھی اور وہ یہی تھی کہ اصحابِ صفہ نادار لوگ تھے، صرف اُن سے کچھ قبول کرنا منع فرمایا گیا تھا۔

فقیہ ومحدث، حافظ، ابوسلیمان، حمد بن محمد، خطابی رحمہ اللہ مختلف توجیہات ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اہلِ علم نے حدیثِ عبادہ ؓ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اہلِ صفہ مفلس صحابہ تھے، جن کا گزر بسر دوسرے لوگوں کے صدقات وخیرات پر ہوتا تھا، ایسے لوگوں سے مال لینا ناپسندیدہ اور (ان کی طرف سے بخوشی دیے گئے) مال کو (بھی) انہیں واپس لوٹانا پسندیدہ عمل ہے۔

''وَتَأَوَّلُوا حَدِيثَ عُبَادَةَ ۔۔۔، وَأَهلُ الصُّفَّةِ قَوْمٌ فُقَرَاءُ، كَانُوا يَعِيشُونَ بِصَدَقَةِ النَّاسِ، فَأَخْذُ الرَّجُلِ الْمَالَ مِنْهُمْ مَكْرُوهٌ، وَدَفْعُهُ إِلَيْهِمْ مُسْتَحَبٌّ''۔(۱)

علامہ، ابوابراہیم، محمد بن اسماعیل، امیر صنعانی رحمہ اللہ اہل علم کی توجیہات ذکر کرتے

(۱) معالم السنن: ۳/۹۹، المطبعة العلمية، حلب

ہوئے فرماتے ہیں: صرف اہل صفہ سے اُجرت (یا تحفہ) لینا مکروہ اور ناپسندیدہ تھا، کیوں کہ وہ خود فقرا تھے، جن کا گزر بسر لوگوں کے صدقات پر ہوتا تھا،لہٰذا ان سے مال لینا ناپسندیدہ کیا گیا۔

”وَفِي أَخْذِ الْأُجْرَةِ مِنْ أَهْلِ الصُّفَةِ بِخُصُوصِهِمْ كَرَاهَةٌ وَدَنَائَةٌ، لِأَنَّهُمْ نَاسٌ فُقَرَاءُ، كَانُوا يَعِيشُونَ بِصَدَقَةِ النَّاسِ، فَأَخْذُ الْمَالِ مِنْهُمْ مَكْرُوهٌ“۔(۱)

اعتراض کرنے سے پہلے حدیث کے سیاق وسباق کو دیکھ تو لینا چاہئے کہ اس حدیث کا محدثین وفقہاء نے کیا مطلب لیا ہے، کیسے ایسی حدیث کو اپنے حق میں دلیل بنانے پر اصرار جس کا اپنا سیاق ان کے استدلال کو یکسر غلط قرار دے رہا ہے؟

دوسرا جواب: تعلیم کتاب کی اُجرت کیسے جائز ہے؟

حدیث میں غور کریں کہ وہاں تعلیم قرآن کے ساتھ تعلیم کتابت بھی مذکور ہے۔ ”عَلَّمْتُ نَاسًا مِنْ أَهْلِ الصُّفَةِ الْكِتَابَ، وَالْقُرْآنَ“تعلیم میں بھی صرف قرآنی تعلیم کا ذکر نہیں، بل کہ کتابت سکھانے کا بھی ذکر ہے اور کتابت سکھانے پر اُجرت لینا سب مسلمانوں کے ہاں بالاتفاق جائز ہے، کیا وجہ ہے کہ تعلیم قرآن کی اجرت حرام ہو اور تعلیم کتابت کی اُجرت حلال ہو؟

تیسرا جواب: حدیث میں ہدیہ کا ذکر ہے نہ کہ اُجرت کا؟

حدیث میں اجرت کا ذکر ہے یا ہدیہ کا؟ حدیث میں ہے کہ یہ ہدیہ تھا۔ ”رَجُلٌ أَهْدٰى إِلَيَّ قَوْسًا مِمَّنْ كُنْتُ أُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ، وَالْقُرْآنَ“ مہاجر صحابی نے سیدنا عُبادہ رضی اللہ عنہ کے کسی مطالبے کے بغیر، محض اپنی خوشی سے احسان کے بدلے کے طور پر تحفے میں کمان دی

(۱) سبل السلام فی شرح بلوغ المرام: ۲/۱۱۷، دار الحدیث

تھی، اگر اس تحفے کا سبب صرف اور صرف قرآنی تعلیم کو ہی قرار دیا جائے اور آگ کی وعید کا سبب بھی وہی ہو تو لامحالہ ثابت ہوگا کہ کسی معلّم کی تعلیم وتربیت سے خوش ہو کر اس کے مطالبے کے بغیر جو تحفہ دیا جائے، وہ ناجائز وحرام اور دین فروشی ودوکان داری کہلائے گا۔

علامہ، ابوالحسن محمد بن عبد الہادی، سندھی رحمہ اللہ سیدنا عُبادہ رضی اللہ عنہ والی حدیث ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’کہا گیا ہے کہ یہ حدیث اُن لوگوں کی دلیل ہے جو قرآنِ کریم پر اُجرت کو حرام ومکروہ قرار دیتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے، جب کہ متأخرین احناف نے اس میں رخصت دی ہے؛ لیکن (میں سندھی کہتا ہوں:) حق کے قریب ترین بات یہ ہے کہ اس حدیث میں تحفے کا ذکر ہے، تعلیم پر مشروط اُجرت کا نہیں اور تحفہ قبول کرنا تو سب مسلمانوں کے یہاں جائز ہے، اس کو حرام کہنا کسی بھی (فقہی) مذہب میں درست نہیں؛ لہٰذا جو لوگ اس حدیث کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل قرار دیتے ہیں، ان کی بات درست نہیں۔

’’ دَلِيلٌ لِمَنْ يُحَرِّمُ أَخْذَ الْأُجْرَةِ عَلَى الْقُرْآنِ وَيَكْرَهُهُ، وَهُوَ مَذْهَبُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَرَخَّصَ فِيهِ الْمُتَأَخِّرُونَ مِن أَهْلِ مَذْهَبِهِ كَذَا قِيلَ :وَالْأَقْرَبُ أَنَّهُ هَدِيَّةٌ، وَلَيسَ بِأُجْرَةٍ مَشْرُوطَةٍ فِي التَّعْلِيمِ، فَهُوَ مُبَاحٌ عِنْدَ الْكُلِّ، وَحُرْمَتُهُ لَا تَسْتَقِيمُ عَلٰى مَذْهَبٍ، وَلَا يَتِمُّ قَوْلُ مَنْ يَقُولُ :إِنَّهُ دَلِيلٌ لِأَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى‘‘۔(۱)

نیز اس حدیث کے حوالے سے لوگوں کی طرف سے ذکر کیے گئے مختلف مفہوم ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’میں کہتا ہوں غور کرنے پر حدیث کے الفاظ ان میں سے کسی بھی مفہوم کا ساتھ نہیں

(۱) حاشیۃ السندی علی سنن ابن ماجہ: ۲/۹، دار الجیل، بیروت

دیتے، یہ کہنا ہی قرین صواب ہے کہ اختلاف تو اُجرت میں ہے، تحفہ قبول کرنے کے جواز میں تو کسی ایک مسلمان نے بھی اختلاف نہیں کیا (اور اس حدیث میں تحفے ہی کا ذکر ہے، لہٰذا اسے اُجرت کے حرام ہونے پر کیسے پیش کیا جا سکتا ہے؟)۔

"كَذَا قَالُوا، قُلْتُ :لَفظُ الْحَدِيثِ لَا يُوَافِقُ شَيْئًا مِّنْ ذٰلِكَ عِنْدَ التَّأَمُّلِ، أَوِ الْأَقْرَبُ أَنَّهُ يُقَالُ :إِنَّ الْخِلَافَ فِي الْأُجْرَةِ، وَأَمَّا الْهَدِيَّةُ، فَلَا خِلَافَ لِأَحَدٍ فِي جَوَازِهَا"۔(۱)

ثابت ہوا کہ سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو وعید مذکور ہے، اس کا تعلق قرآنی تعلیم اور دینی اُمور پر اُجرت سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔

پتہ چلا کہ زیرِ بحث مسئلہ اُجرت سے متعلق ہے نہ کہ ہدیہ سے متعلق، اگر ہدیہ بھی جائز نہیں ہے تو نبی کریم ﷺ کی شان میں بے ادبی لازم آئے گی، کیونکہ صحابہ کرامؓ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں جو تحائف بغیر مطالبے کے محض اپنی خوشی سے پیش کرتے تھے، ان تحائف کا محرک آپ ﷺ کی دینی تعلیم و تربیت تھی یا کوئی دنیاوی امر؟ صحابہ کرام میں کسی نے آپ ﷺ کو کھانے کی دعوت دی، اور کوئی صحابی کھانا تیار کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کی، کسی نے بھُنی ہوئی بکری پیش کی، کوئی کھجوروں کے خوشے حاضر کیے، کوئی صحابی حلوہ تو کوئی دُودھ کا پیالہ پیش کیا، ان سب تحائف کی وجہ سوائے آپ ﷺ کی دینی تعلیم و تربیت کے اور کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی یہی تھا کہ صحابہ کرام کو قرآنی و دینی تعلیم مہیا فرمائیں:

{يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ}(۲)

اگر سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ کو دی گئی کمان والی وعید قرآنی و دینی تعلیم پر منطبق کریں تو بعینہٖ یہی صورتِ حال رسول اللہ ﷺ کی خدمت اِقدس میں پیش کی جانے والے تحائف کی

---

(۱) حاشیۃ السندی علی سنن ابن ماجہ: ۲/ ۹، دار الجیل، بیروت

(۲) آل عمران: ۱۶۴

ہے، جو حکم رسولِ کریم ﷺ کو پیش کیے جانے والے تحائف کا ہوگا، وہی سیدنا عُبادہ رضی اللہ عنہ کو پیش کی گئی کمان کا ہوگا، چنانچہ ان تحائف کے جائز ہونے پر مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہے، اور آج تک اہل علم میں سے کسی نے ان کے ناجائز و حرام قرار نہیں دیا۔

چوتھا جواب، دونوں حدیثوں میں تعارض ہو تو اصولِ حدیث

جب قرآنی دَم پر معاوضے کی بابت رسولِ اکرم ﷺ سے استفسار کیا گیا تو آپ ﷺ نے جواب میں صرف ''ہاں'' پر اکتفا نہیں کیا، بل کہ صراحتاً قرآنِ کریم کی اُجرت کو نام لے کر بہترین اُجرت قرار دیا، جب کہ اس حدیث میں اگر قرآنی تعلیم پر اُجرت لینے کی وعید ہوتی تو آپ ﷺ ضرور اسی طرح صراحتاً ہی قرآنی تعلیم پر اُجرت کو آگ کا طوق اور انگارہ قرار دیتے؛ لیکن ایسا کچھ بھی منقول نہیں، جواز و عدم جواز والی روایت میں تعارض کی صورت میں ترجیح مقدم ہے یا تطبیق ؟ اصول ہے کہ تطبیق کی شکل کو مقدم رکھا جائے گا، یہاں تطبیق یہی ہے کہ عدم جواز کی روایت اصحابِ صفہ کے ساتھ خاص ہو، اور جواز والی روایت عام ہو، ان حقائق سے یہ بات روشن ہوگئی کہ مذکورہ حدیث دینی تعلیم پر اجرت کے عدم جواز میں عام نہیں ہے۔

پانچواں جواب؛ حدیث تعلیم دین سے نہیں تلاوت سے متعلق

قرآن کریم کی تعلیم پر معاوضہ لینا جائز ہے البتہ قرآنِ کریم کی تلاوت پر معاوضہ لینا جائز نہیں، جیسا کہ: سیدنا عبد الرحمن بن شبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: قرآنِ کریم کی قراءت کرو، اس میں غلو کرو نہ اس سے دُوری اختیار نہ کرو، نہ اس کے ذریعے کھاؤ اور نہ اس کے ذریعے زیادہ مال کی خواہش رکھو۔

''اِقْرَءُوا الْقُرْآنَ، وَلَا تَغْلُوا فِيهِ، وَلَا تَجْفُوا عَنْهُ، وَلَا تَأْكُلُوا بِهِ،

وَلَا تَسْتَكْثِرُوا بِهِ"۔(۱)

اس حدیث میں صاف طَور پر قرآن کی قراءت کا ذکر ہے، لہٰذا اسے کتاب اللہ کی تعلیم اور دینی اُمور پر اُجرت کے خلاف پیش نہیں کیا جا سکتا، اس میں تو تعلیم کے معاوضے کا ذکر تک موجود نہیں۔

عدم جواز والی روایات منسوخ ہیں

امام بیہقی عدم جواز کی ضعیف اور موضوع رویات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اور اگر عدم جواز کی کوئی روایت ثابت بھی ہو تو وہ ابن عباس ؓ کی حدیث سے منسوخ ہوگی، اور اسی طرح کی حدیث ابوسعید الخدری ؓ سے بھی مروی ہے اور عام اہل علم نے ان احادیث کے ظاہر کی وجہ سے ان (ضعیف) روایات کے ترک پر استدلال کیا ہے۔

"﴿ويشبه ان كان شئ من هذا ثابتا ان يكون منسوخا بحديث ابن عباس وبما روى فى معناه عن ابى سعيد الخدرى ويستدل على ذلك بذهابة عامة اهل العلم على ترك ظاهره وبان ابا سعيد وابن عباس انما حملا الحديث على او اخر عهد النبى ﷺ ويشبه ان يكون عبادة بن الصامت حمله فى الابتداء والله اعلم﴾(۲)

منع والی روایات قابل استدلال نہیں

حافظ ابن حزم نے ان روایات کو بھی ذکر کیا ہے کہ جن میں ممانعت کا ذکر ہے اور ایسی

---

(۱) مسند إمام أحمد، حدیث: ۱۵۵۲۹، مؤسسة الرسالة، بیروت، مسند أبي يعلى الموصلي، حدیث: ۱۵۱۸، دار المأمون للتراث، دمشق، وسندہٗ صحیح، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند کو "قوی" قرار دیا ہے۔ (فتح الباری: ۹/۱۰۱، دار المعرفة، بیروت)
(۲) معرفة السنن والآثار ۵۔ ۳۸۱، ۳۸۲

تمام روایت پر جرح کی ہے اور فرماتے ہیں : اور اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے جو ممانعت کی روایت آئی ہے ان میں کوئی روایت بھی صحیح نہیں ہے۔

"﴿ اما الاحادیث فی ذلکعن رسول اللہ ﷺ فلا یصح منها شئ ﴾ (۱)

ممانعت والی روایت کی حیثیت

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں" اور بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ احادیث ان احادیث کی وجہ سے منسوخ ہیں کہ جن میں تعلیم القرآن پر اجرت لینے پر وعید آئی ہے اور جسے ابو داؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے لیکن ایسے لوگوں کا تعقب کیا گیا کہ انہوں نے نسخ کا دعویٰ صرف احتمال کی بناء پر کیا ہے اور احتمال سے نسخ ثابت کرنا مردود ہے اور ان احادیث میں مطلق منع کی صراحت نہیں ہے، بلکہ وہ مختلف اوقات سے متعلق ہیں کہ جو تاویل کا احتمال رکھتی ہیں تاکہ اس طرح وہ روایات صحیح احادیث کے موافق ہو جائیں جیسا کہ اس باب کی حدیث ہے، نیز یہ احادیث اس قابل نہیں ہیں کہ ان (ضعیف روایات) کے ذریعے کوئی حجت قائم ہو سکے، پس وہ روایات احادیث صحیحہ کے معارض نہیں ہیں اور اس کی بحث ہم کتاب النکاح باب التزویج علی تعلیم القرآن (تعلیم القرآن کے عوض نکاح کرنے کا بیان) میں کریں گے۔)

"وادعی بعضهم نسخه بالاحادیث الوارده فی الوعید علی اخذ الاجرة علی تعليم القرآن وقد رواها ابو داؤد وغيره، وتعقب بانه اثبات للنسخ بالاحتمال وهو مردود، وبان الاحاديث ليس فيها تصريح بالمنع على الاطلاق بل هي وقائع احوال متحملةللتاويل لتوافق الاحاديث الصحيحة

(۱) المحلی بالآثار لابن حزم اندلسی : ۷/ ۲۱

کحدیثی الباب، وبان الاحادیث المذکورۃ ایضا لیس فیھا ماتقوم بہ الحجۃ فلاتعارض الاحادیث الصحیحۃ وسیکون لناعودۃ الی البحث فی ذلک فی کتاب النکاح فیا لتزویج علی تعلیم القرآن"(۱)

محدثین اُجرت لینے والے کی حدیث کیوں قبول نہیں کرتے تھے؟

اسلاف دینی تعلیم پر اجرت نہیں لیتے تھے، محدثین ایسے محدث کی روایت قبول نہیں کرتے تھے جو روایت کے سنانے پر پیسے لیتا ہو؛ لیکن بعد میں جب مسلم حکومتیں ختم ہوگئیں اوراسی کے دینی وازع کمزور پڑگیا تو پھر علما امت نے دین اور شریعت کو بچانے اور مساجد ومدارس کو برباد وویران سے ہونے سے بچانے کیلئے دینی تعلیم پر اجرت لینا جائز قرار دیا، یہ معاذ اللہ اپنی جانب سے شریعت گڑھنا نہیں ہے؛ لیکن کبھی ایسی ضرورت ہوتی کہ آپ کے سامنے دو اختیارات ہیں، اور دونوں میں نقصانات ہیں تو پھر کمتر نقصان کو اختیار کیا جاتا ہے، شریعت میں اس کے نظائر بے شمار ہیں۔

منکرین اُجرت کی دوسری دلیل کی حقیقت

بعض لوگوں نے کچھ قرآنی آیات سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ ؛فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

"وَمَا اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ"(۲)

ترجمہ: ہر نبی نے کافروں سے فرمایا: میں تم سے اس تبلیغ دین پر کسی اُجرت کا سوال نہیں کرتا، میرا اجر تو رب العالمین ہی کے پاس ہے۔"اس آیت سے معلوم ہوا کہ دینی کاموں

(۱)فتح الباری کتاب الاجارۃ ۴/۴۵۴

(۲)الشعراء:۱۰۹

پر اجرت لینا درست نہیں ہے۔

پہلا جواب

یہ اور اس طرح کی دیگر آیات قطعاً دینی اُمور پر اُجرت کو حرام قرار نہیں دیتیں، کیوں کہ ان میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں، جس میں حرمت کی طرف ادنیٰ اشارہ بھی ہو، ان آیات میں تو کفار کو خطاب ہے، جو دین سے بیزار تھے اور تبلیغ دین کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، انہیں فرمایا گیا کہ تمہیں مفت میں خیر وبھلائی پہنچائی جا رہی ہے، اس پر کسی قسم کا کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگا جا رہا، کیا وجہ ہے کہ تم پھر بھی اس سے روگرانی وتنگی محسوس کرتے ہو اور اعراض سے کام لیتے ہو؟ اِن کفار سے اگر اُجرت طلب کی جاتی تو وہ اسے بوجھ محسوس کرتے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''اَمْ تَسْاَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ''(۱)

(اے نبی!) کیا آپ اُن سے کسی اُجرت کا سوال کرتے ہیں کہ وہ تاوان کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں؟

لیکن مسلمانوں کا معاملہ کفار ومشرکین سے یکسر مختلف ہے، مسلمان تو اہل علم کے ساتھ مالی تعاون کو انفاق فی سبیل اللہ سمجھ کر سعادت دارین خیال کرتے ہیں اور انفاق فی سبیل اللہ منافقوں پر گراں ہوتا ہے نہ کہ پختہ مسلمانوں پر۔

دوسرا جواب

ان آیات میں صرف اور بلا معاوضہ تبلیغِ دین کی بات ہوئی ہے، یعنی ''اپنی جان اور اپنا مال''، تبلیغ دین میں ہوگا، آپ ﷺ تبلیغِ دین کے وقت معاوضہ قبول نہ فرماتے تھے، اس سے کون انکار کرتا ہے؟ بلا معاوضہ تبلیغ کو سب افضل واعلیٰ عمل سمجھتے ہیں اور اسے ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے؛ لیکن اس سے اُجرت کا ناجائز ہونا کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟

---

(۱) الطور: ۴۰/ ۵۲

دو سبق آموز مثالیں

اگر کوئی کاریگر اپنے محلے کے کسی لڑکے کو کہے کہ میں تمہیں مفت میں فلاں ہنر سکھاتا ہوں اور وہ پھر بھی سیکھنے میں تعرض سے کام لے، تو وہ یہی کہے گا کہ میں اس بھلائی پر تم سے کسی معاوضے کا طلب گار نہیں ہوں، پھر تم کیوں اس سے گریزاں ہو؟ اُس کاریگر اور ہُنرمند کی یہ خیرخواہی قابلِ قدر بھی ہو گی اور قابلِ ذکر بھی؛ لیکن اس سے ہُنر سکھانے کی اُجرت ناجائز و حرام نہیں ہو سکتی۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی ڈاکٹر یا طبیب فلاحِ عامہ کے سلسلے میں مفت علاج کرے تو اس کا یہ عمل افضل و اعلیٰ ضرور ہو گا اور اس کی یہ نیکی لوگوں کے لیے بطور مِثال پیش کی جائے گی، لیکن یہ سب کچھ دوسرے طبیبوں کی فیس اور اُجرت کے ناجائز و حرام ہونے کا سبب تو نہیں بن سکتا۔

تیسری دلیل کی حقیقت

منکرینِ اُجرت اس قرآنی آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں: ”وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیَاتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ“(۱) ”میری آیات کے بدلے میں تھوڑی قیمت وصول نہ کرو اور مجھ ہی سے ڈرو۔“ اس آیت کی رو سے بعض لوگ کہتے ہیں دینی تعلیم پر اجرت لینا گویا دین فروشی ہے۔

پہلا جواب

یہاں رسولِ اکرم ﷺ کے ہم عصر اہل کتاب کی بات ہو رہی ہے اور اس آیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب کی تعلیم پر اُجرت لیتے تھے، اس لیے اُن کو یہ حکم سنایا گیا، بل کہ وہ لوگ تو نبی اکرم ﷺ سے شدید حسد اور طلبِ دنیا کی بنا پر کتاب پر ایمان ہی نہیں رکھتے

(۱) البقرۃ: ۲/ ۴۱

تھے، وہ تو اللہ کی کتاب میں لفظی و معنوی تحریف کے مرتکب ہوتے تھے، تب ہی تو ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور وہ بندر اور خنزیر بنا دیے گئے، وہ تو کتاب کی آیات کا من پسند مطلب اخذ کر کے لوگوں کا مال ناحق طریقے سے ہڑپ کرتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ تنبیہ فرمائی کہ تم دنیا کی چند روزہ جاہ و عیش کی خاطر کتاب اللہ کو بیچ کر اپنی آخرت برباد نہ کرو، تم خواہ جتنا بھی کمالو، وہ تھوڑا ہے، کیوں کہ آخرت کے مقابلے میں متاعِ دنیا جتنا بھی ہو، قلیل ہی ہے۔

دوسرا جواب: تفسیر القرآن بالقرآن

تفسیر کا اصول ہے کہ قرآن کی آیات کی تفسیر دوسری آیات سے ہو تو یہ افضل درجہ کی تفسیر کہلاتی ہے، درجِ ذیل آیات میں اہل کتاب کی رَوِش کا تفصیلی تذکرہ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ آیت کی تفسیر کا تعلق کس سے ہے:

پہلا جرم اہلِ کتاب کا جس پر مذکورہ آیت میں تنبیہ کی گئی، وہ ہے اپنی طرف سے لکھی باتوں کو خدا کی طرف منسوب کر کے اُس پر اُجرت وصول کرنا:

”فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ“(۱)

”ان لوگوں کے لیے تباہی ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) ہے تاکہ اس کے ذریعے تھوڑی قیمت حاصل کر سکیں، جو ان کے ہاتھوں نے لکھا، اس کی وجہ سے بھی ان کے لیے ہلاکت ہے اور جو وہ کماتے ہیں، اس کی بنا پر بھی ان کے لیے بربادی ہے۔“

دوسرا جرم اہلِ کتاب کا جس پر مذکورہ تنبیہ نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ قرآنی احکام

(۱) البقرۃ: ۲/ ۷۹

کو چھپانا تاکہ اہلِ ثروت سے مال بٹورا جاسکے۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتَابِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیلًا اُولٰئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُونِھِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ" (۱)

"جو لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب کو چھپاتے اور اس کے بدلے میں تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں، بلاشبہ وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھرتے ہیں، روزِ قیامت اللہ تعالیٰ نہ اُن سے کلام فرمائے گا نہ انہیں پاک کرے گا اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔"

تیسرا جرم جس پر اہل کتاب کو مذکورہ تنبیہ نازل ہوئی وہ ہے احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دینا۔

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ فَنَبَذُوْہُ وَرَاءَ ظُھُوْرِھِمْ وَاشْتَرَوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیلًا فَبِئْسَ مَایَشْتَرُوْنَ" (۲)

"جب اللہ نے اُن لوگوں سے وعدہ لیا جنہیں کتاب دی گئی تھی کہ تم ضرور اسے لوگوں سے بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں، تو انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں تھوڑی قیمت حاصل کرلی، بہت بُرا ہے جو وہ سودا کرتے ہیں۔"

چوتھا جرم یہ تھا کہ احکام کی ترمیم سے بندوں کو ہدایت سے روک دینا، جس پر مذکورہ وعید نازل ہوئی۔ "اِشْتَرَوْا بِاٰیَاتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِہٖ اِنَّھُمْ سَاءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" (۳)

---

(۱) البقرۃ: ۲/۱۷۴

(۲) آل عمران: ۳/۱۸۷

(۳) التوبۃ: ۹

''انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے میں تھوڑی قیمت حاصل کی اور اس کے راستے سے روکا، بلاشبہ بہت بُرا ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

مذکورہ آیات میں غور کرنے سے تفسیر قرآن سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد پر واضح ہو جائے گا کہ کتاب اللہ کے بدلے میں تھوڑی قیمت لینے سے مراد دنیاوی اغراض کے بدلے کتاب اللہ کی آیات کو چھپانا اور ان میں لفظی ومعنوی تبدیلی وتحریف کرنا، احکام کو پس پشت ڈال دینا ہے۔

قرآنی آیات بیچنے کا مطلب کیا ہے؟

جو آیات اجرت لینے پر منع کی ذکر کی ہیں وہ سب کے سب یہودیوں کے اس فعل پر اتری ہیں کہ وہ تھوڑی رقم لے کر سائل کو اس کے حسب مرضی فتوی دیا کرتے تھے اور کلام الٰہی میں اپنی جانب سے حذف واضافہ کیا کرتے تھے بسا اوقات ایسا بھی کیا کرتے تھے کہ اپنی جانب سے کوئی بات گھڑلی اور کہہ دیا کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ ''یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عنداللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً'' دینی تعلیم اور دینی تحریف میں کس قدر زمین وآسمان کا فرق ہے، دینی تحریف پر وعید کی آیات کو دینی تعلیم پر منطبق کرنا کس قدر دین میں تحریف ہے، تحریف کا مقصد امحاءِ دین ہے جبکہ تعلیم کا مقصد احیاءِ دین ہے، اس فرق کو سمجھے بغیر استدلال کرنا قرآن سے بغاوت کرنا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی شان میں بے ادبی لازم آئے گی

اگر اس کا معنی اجرت لینا ہوتا تو نبی کریم ﷺ نے بھی تو فرمایا ہے: ''واضربوا لي معکم سہما'' تو آپ ﷺ نے مسئلہ بتایا کہ یہ اجرت لینا تمہارے لیے جائز ہے اور پھر حصے کا مطالبہ بھی کیا، تو فتوی دے کر فتوی کی فیس لینا، اگر اللہ کی آیتوں کو بیچنا ہے تو معاذ اللہ کیا رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت کے بدلے بیچا تھا؟ ہرگز نہیں! قطعاً ایسا

نہیں ہے؛ بلکہ اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچنے کا معنی ہی اور ہے اور انہوں نے کچھ اور بنا دیا ہے۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا کا مطلب کیا ہے؟

فرمانِ باری تعالی: وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ"

ترجمہ: اور جو میں نے تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرنے والا (قرآن) نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ اور اس پر سب سے پہلے کفر کرنے والے مت بنو، اور نہ ہی میری آیات کے بدلے میں معمولی قیمت بٹورو، اور مجھ ہی سے ڈرو۔(۱)

یہاں معمولی قیمت سے مراد لوگوں کو راضی رکھنا ہے، قرآن کریم کی تعلیم پر اجرت لینا اس سے مراد نہیں ہے، چنانچہ:

۱۔طاہر ابن عاشور رحمہ اللہ کہتے ہیں: "فرمانِ باری تعالی: "لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَناً قَلِيلاً" تاکہ وہ اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیں(۲) یہ اصل میں اس آیت کی طرح ہے: "وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا" اور نہ ہی میری آیات کے بدلے میں معمولی قیمت بٹورو(۳)

اور یہاں پر قیمت سے مراد لوگوں کو راضی رکھنا ہے، کہ وہ احکام دین لوگوں کی چاہت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں، یا اپنے آپ کو عالم سمجھتے ہیں حالانکہ وہ جاہل ہیں، چنانچہ اپنی اسی جہالت کی بنا پر قصے اور کہانیوں سے بھر پور کتابیں لکھ مارتے ہیں، اور انتہائی سطحی قسم کی

(۱)البقرۃ:۴۱

(۲)البقرۃ:۷۹

(۳)البقرۃ:۴۱

معلومات ان میں درج کرتے ہیں صرف اس لیے کہ مجمع پر اپنا دھونس جما سکیں، کیونکہ ان کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں تھی کہ صحیح علم تک پہنچ سکیں، لیکن ان میں منظر عام پر آنے اور بڑا بننے کی چاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی تو انہوں نے سطحی قسم کی باتیں جوڑیں، من گھڑت باتیں اکٹھی کیں، اور ایسی بے سر و پا چیزیں جمع کیں جو صحیح علم کا بالکل مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں، پھر انہیں لوگوں میں پھیلانے کا کام شروع کر دیا اور انہیں اللہ اور اس کے دین کی جانب منسوب کرنے لگے، اصل میں جاہل لوگوں کی یہی عادت ہوتی ہے جو نااہلی کے باوجود بڑا بننے کی چاہت رکھتے ہیں، تاکہ عوام الناس اور ایسے لوگوں کی نظروں میں اہل علم نظر آئیں جو صحت مند جسامت اور سوجن میں فرق نہ کر سکیں"۔(۱)

آیت کا دوسرا مطلب

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ: اس آیت میں وہ شخص مراد ہے جس پر قرآن کی تعلیم دینا متعین اور فرض ہو چکا ہو یعنی: علاقے میں اس کے علاوہ کوئی اور قرآن کی تعلیم دینے والا نہ ہو اور وہ بغیر اجرت کے قرآن کی تعلیم دینے سے انکار کر دے، البتہ اگر کسی شخص پر قران کی تعلیم دینا متعین اور فرض نہ ہو اس کیلیے اُجرت لینا جائز ہوگا، اس کی دلیل حدیث میں موجود ہے؛ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص پر قرآن مجید کی تعلیم دینا متعین ہو جائے؛ لیکن اس کے پاس اپنے اور اہل خانہ کا پیٹ پالنے کیلیے کچھ نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی اس پر قرآن کی تعلیم دینا واجب نہیں ہوگا، اس لیے وہ شخص (اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کیلیے) اپنے کام اور پیشے پر محنت جاری رکھ سکتا ہے، اس صورت میں حکمران کی ذمہ داری ہے کہ اقامت دین کیلیے اقدامات کرے، اگر حکمران نہیں کرتا تو مسلمان خود سے اس ذمہ داری کو نبھائیں؛ کیونکہ جس وقت ابو بکر

---

(۱) التحریر والتنویر: ۱/ ۴۷۷

صدیقؓ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو ان کے گھر بار کی ضروریات پوری کرنے کیلیے کوئی ذریعہ نہیں تھا، تو انہوں نے کپڑے اٹھائے اور بازار میں بیچنے کیلیے نکل کھڑے ہوئے، لوگوں نے اس بارے میں ان سے بات کی تو کہنے لگے: میں اپنے گھر والوں کے اخراجات کہاں سے ادا کروں؟ اس پر لوگوں نے آپ کیلیے معقول مشاہرہ مقرر کر دیا۔(۱)

اس طرح کی آیات کے مخاطب بنی اسرائیل تھے

ان میں خطاب بنی اسرائیل کے نافرمان اہلِ علم سے کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُواْ نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُواْ بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ο وَآمِنُواْ بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَكُمْ وَلاَ تَكُونُواْ أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلاَ تَشْتَرُواْ بِآيَاتِي ثَمَناً قَلِيلاً وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ"(۲)

اے بنی اسرائیل! جو میں نے تم پر نعمتیں کی ہیں، انہیں یاد کرو اور جو میرا وعدہ ہے اس کو پورا کرو، اور میں تمہارے ساتھ کیے گئے وعدے کو نبھاؤں گا اور مجھ سے ہی ڈرو اور جو میں نے تم پر نازل کی ہے کتاب، قرآن مجید، اس کتاب کی جو تمہارے پاس تورات وانجیل، اس کی تصدیق کرنے والی ہے، تم اس قرآن کے کافر اور انکاری نہ بن جاؤ، اور اللہ کی آیتوں کے بدلے میں تھوڑی قیمت نہ خریدو۔

آیت پوری پڑھی جائے تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے، یعنی حق بات کو چھپانے کے عوض

---

(۱) اور وہ احادیث جن میں اجرت لینے سے منع کیا گیا ہے، ان میں سے کوئی بھی قابل استدلال نہیں، اہل علم اور محدثین کے ہاں وہ ثابت ہی نہیں ہوتیں، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ان روایات پر خوب جرح کی ہے؛ لہذا سند کے اعتبار سے کوئی بھی روایت ایسی نہیں ہے جس پر عمل کرنا ممکن ہو" انتہی مختصراً۔ تفسیر القرطبی: ۱/۳۳۶

(۲) البقرہ: ۴۰۔۴۱

مال حاصل نہ کرو ہم بھی کہتے ہیں کہ جو امام وخطیب حق چھپاتا ہے، کہیں مجھے چھٹی نہ کروا دے، یہ غلط اور ناجائز ہے، کیا آج جو ائمہ کرام وعلماءعظام دینی خدمات میں مصروف ہیں وہ اور مذکورہ آیت والے بنی اسرائیل کس علم وعقل دشمن کو برابر نظر آرہے ہیں؟ کیا آج کے علماءِ حق حق بات چھپاتے ہیں؟ کیا تحریف کرتے ہیں؟ یا حق گوئی کے ساتھ حق کو عام کرتے ہیں؟

اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ کا مطلب؟

فرمانِ باری تعالی :اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ، ترجمہ: تم اس کی اتباع کرو جو تم سے اجرت نہیں مانگتے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔(۱)

۱۔ یہ اور اس طرح کی دوسری آیات کو اہل علم نے قرآن مجید کی آیات واحادیث کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ ”یہ رسولوں اور ان کے پیروکاروں کا شیوہ نہیں ہے کہ اجرت کو مقصود بنا کر خدمت دین انجام دیں“ یہی بات علما کرام مانتے ہیں کہ اُجرت کو مقصود نہ بنایا جائے؛ بلکہ مقصد خدمت دین ہو، تبھی تو معمولی تنخواہ پر بھی ساری زندگی خدمت دین پر قربان کر دیتے ہیں، علماء کرام اُجرت کو ضرورت کا درجہ ہی دیتے ہیں۔

۲۔ یہ آیت صرف ان لوگوں کے بارے میں ہے جن پر تبلیغ، دعوت، اور تعلیم فرض عین ہو جائے، جن پر فرض عین نہیں ہے ان کے بارے میں یہ آیت نہیں۔

۳۔ ان آیات کو ایسے شخص کے بارے میں کراہت پر محمول کیا جا سکتا ہے جسے اجرت لینے کی ضرورت نہیں ہے، شیخ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ اسی موقف کے قائل تھے، انہوں نے اس معنی کی متعدد آیات یکجا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ: ”اس آیت کریمہ سے یہ بات اخذ کی جاتی ہے کہ: رسولوں کے نقش قدم پر چلنے والے علمائے کرام اور دیگر

(۱) یس :۲۱

افراد کیلیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پاس موجود علم بلا معاوضہ آگے پہنچائیں، اس کا معاوضہ مت لیں، وہ کتاب اللہ کی تعلیم دینے پر اجرت نہ لیں، عقائد، حلال وحرام اور دیگر شرعی علوم کی تعلیم پر اجرت مت لیں" انتہی۔(۱)

تیسرا جواب: مفسرین کی تفاسیر سے شہادت

چنانچہ علامہ سدی رحمہ اللہ (م: ۱۲۷ھ) فرماتے ہیں: "تم میری نازل کردہ آیات کو چھپا کر تھوڑا (دنیاوی) فائدہ نہ لو۔

"وَلاَتَأْخُذُوا طَمَعًا قَلِيلًا عَلٰى أَنْ تَكْتُمُوا مَا أَنْزَلْتُ"۔(۲)

خود امام، ابوجعفر محمد بن جریر، طبری رحمہ اللہ نے یہ تفسیر کی ہے: تم میری آیات کو ادنیٰ قیمت میں فروخت کرتے ہو اور اُن کے بدلے میں تھوڑا سامان حاصل کرتے ہو، میں نے اپنے رسول پر جو وحی نازل کی ہے، اس کے ساتھ کفر کرتے ہو اور میرے نبی کی نبوت کا انکار کرتے ہو، لہٰذا اس بات سے ڈرو کہ میں تمہارے اوپر بھی وہی عبرت ناک سزائیں اور عذاب نازل کر دوں، جو تم سے پہلے اُن لوگوں پر نازل کی تھیں، جنہوں نے تمہارے جیسی رَوِش اختیار کی تھی۔

"فَاتَّقُونِ فِي بَيْعِكُمْ آيَاتِي بِالْخَسِيسِ مِنَ الثَّمَنِ، وَشِرَائِكُمْ بِهَا الْقَلِيلَ مِنَ الْعَرَضِ، وَكُفْرِكُمْ بِمَا أَنْزَلْتُ عَلٰى رَسُولِي وَجُحُودِكُمْ نُبُوَّةَ نَبِيِّي، أَنْ أُحِلَّ بِكُمْ مَا أَحْلَلْتُ بِأَسْلَافِكُمْ

---

(۱) أضواء البیان: ۲/ ۱۷۹

(۲) تفسیر الطبری: ۱۰/ ۳۴۵، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، وسندہ حسنٌ

الَّذِينَ سَلَكُوا سَبِيلَكُمْ مِنَ الْمَثُلَاتِ وَالنَّقِمَاتِ"۔(۱)

قرآن وحدیث کو ہم نے زیادہ سمجھا یا سلف صالحین نے؟

مروّجہ دینی تعلیم کی حرمت پر کسی مفسر نے مذکورہ آیت نہیں پیش کی اور نہ اس سے استدلال کیا تو پھر کسی شخص کا جو فن تفسیر اور فن فقہ سے نابلد ہے اپنی نادانی کا ثبوت تفسیر بالرائے سے کر کے کسی مسئلہ کی حلت وحرمت کی جہت کو کیسے طے کر سکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ مذکورہ آیت کی یہ تفسیر کرنا کہ دینی اُمور پر اُجرت لینا حرام ہے، قرآنِ کریم کی معنوی تحریف اور احادیث صحیحہ وفہم سلف کی صریح مخالفت ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ مذکورہ تمام آیات واحادیث اور دلائل اسلافِ امت اور ائمہ دین کے پیش نظر تھے؛ لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی دینی اُمور پر اُجرت کا حرام ہونا ثابت نہیں کیا، ہم کیسے تسلیم کر لیں کہ وہ سب ان آیات کی صحیح تفسیر سے ناآشنا رہے اور اصل تفسیر منکروں کے سمجھ میں آ گئی، جو اسلافِ امت کو "دین فروش" اور "دوکان دار" قرار دیتے ہیں؟

اسلافِ اُمّت سب سے بڑھ کر ورع وتقویٰ والے تھے، علم میں فائق اور دین پر عمل کرنے میں بے تکلف تھے، اگر ان دلائل سے تعلیم قرآن اور دینی اُمور پر اُجرت کا حرام ہونا ثابت ہوتا تو وہ ضرور اس کے قائل ہوتے۔

---

(۱) تفسیر الطبری: ۱/ ۵۶۶، مؤسّسۃ الرسالۃ، بیروت، وسندہٗ حسنٌ۔

اعتراض: اس آیت کی تفسیر میں امام، ابو العالیہ، ریاحی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ "لَا تَأْخُذُوا عَلَيْهِ أَجْرًا"۔ تم اس پر اُجرت نہ لو۔ (تفسیر الطبر: ۱/ ۵۶۵) جواب: یہ قول امام موصوف سے ثابت نہیں، کیوں کہ اس کے راوی ربیع بن انس کے بارے میں امام ابن حبان رحمہ اللہ (م 354 :ھ) لکھتے ہیں: اہل علم اس کی اُن احادیث سے بچتے ہیں، جو ابوجعفر نے اس سے بیان کی ہیں، کیوں کہ ان میں بہت زیادہ اضطراب ہے۔ "وَالنَّاسُ يَتَّقُونَ حَدِيثَهُ مَا كَانَ مِنْ رِوَايَةِ أَبِي جَعْفَرٍ عَنْهُ، لِأَنَّ فِيهَا اضْطِرَابٌ كَثِيرٌ"۔ (الثقات: ۴/ ۲۲۸، دائرۃ المعارف العثمانیّۃ، الھند) یہ روایت بھی ابوجعفر، عیسیٰ بن ابو عیسیٰ، رازی نے ربیع بن انس سے بیان کی ہے، لہٰذا یہ روایت مضطرب ومردود ہے۔

عظیم تبع تابعی، شیخ الاسلام، عبدالرحمن بن عمرو، اوزاعی رحمہ اللہ (م: ۱۵۷ھ) کی یہ نصیحت منکروں کے لیے بہت قابل غور ہے: آپ اسلاف کے آثار کو لازم پکڑے رکھیے، اگرچہ لوگ آپ کو چھوڑ جائیں اور آپ بعد والوں کی آراء سے بچ کر رہیے، اگرچہ وہ اپنی بات کو (اپنے تئیں دلائل سے) مزین کر کے پیش کریں۔

"عَلَیکَ بِآثَارِ مَنْ سَلَفَ، وَإِنْ رَفَضَکَ النَّاسُ، وَإِیَّاکَ وَآرَاءَ الرِّجَالِ، وَإِنْ زَخْرَفُوا لَکَ بِالْقَوْلِ"۔(۱)

قربِ قیامت لوگ قرآن پڑھ کر دنیا چاہیں گے

اعتراض قرب قیامت ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ قرآن پڑھیں گے "یتعجلونه ولا یتأجلونه" کہ قرآن پڑھ کر وہ دنیا چاہیں گے اور آخرت نہیں چاہیں گے، یعنی قرآن پڑھنے کا مقصد ثواب کمانا نہیں بلکہ صرف اور صرف دنیا کمانا ہے۔

جواب: تو یقینا ایسا کام ناجائز ہے، ہم نے کب اسے جائز قرار دیا ہے؟ قرآن بندہ پڑھے پڑھائے اور اس کے اندر اللہ کی رضا کا حصول مقصد نہ ہو بلکہ صرف دنیا کمانا مقصود ہو دین سیکھ کر تو بالکل ناجائز ہے، ہاں! اگر اللہ کی رضا بھی مقصود ہو اور ساتھ ساتھ بندہ دنیا بھی کما لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لہٰذا دینی امور میں سے کوئی بھی معاملہ ہو اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ اعتراضات سارے کے سارے باطل ہیں۔

منکرین کی چوتھی دلیل قیاس کی حقیقت

دینی اُمور پر اُجرت کے جواز کی صریح نصوص فہم سلف کی روشنی میں ذکر کی جا چکی ہیں،

---

(۱) الشريعة للآجري، باب ذمّ الجدال والخصومات في الدين ۱: ۱۴۵/۱۴۵، دار الوطن، الرياض، جامع بيان العلم وفضله لابن عبد البرّ، باب ما جاء في ذمّ القول في دين الله تعالٰى بالرأي والظنّ والقياس ۲: ۱۰۷۱/۱۰۷۱

بعض لوگ ان نصوص کو اپنے اس قیاس کی بنا پر ردّ کرتے ہیں کہ نماز و روزہ اللہ کو راضی کرنے والے کام ہیں، جس طرح اِن پر اُجرت لینا جائز نہیں، اسی طرح دینی اُمور بھی رضاے الٰہی کے لیے سر انجام دیے جاتے ہیں، لہٰذا اِن پر بھی اُجرت جائز نہیں۔

پہلا جواب: نصوص کے خلاف قیاس کرنا جائز ہی نہیں، اگر کوئی قیاس کرتا ہے تو وہ شخص ماخذ شریعت کے مدارج سے واقف ہی نہیں ہے۔

دوسرا جواب: یہ قیاس درست نہیں ہے؛ کیوں کہ نماز و روزہ انسان کے اپنے ساتھ خاص ہے، جب کہ تعلیم کا دوسرے کے ساتھ بھی تعلق ہے، مشہور مفسر، علامہ، ابوعبداللہ، محمد بن اَحمد، قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: مخالفین کا نماز و روزے پر قیاس کو دلیل بنانا تو وہ فاسد ہے؛ کیوں کہ یہ نص کے مقابلے ہے، جبکہ نماز و روزے اور قرآنی تعلیم میں فرق ہے؛ وہ یہ کہ نماز اور روزہ تو ایسی عبادات ہیں، جو کرنے والے کے ساتھ خاص ہیں؛ یعنی اُس عبادت کا ثواب اُسی کے لئے ہے؛ جب کہ قرآن کی تعلیم ایسی عبادت ہے جو سکھانے والے کے غیر (سیکھنے والے) کی طرف متعدی ہوتی ہے؛ لہٰذا اسے سکھانے کی کوشش پر اُجرت جائز ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کی کتابت سکھانے کی اُجرت لینا جائز ہے۔

”وَأَمَّا مَا احْتَجَّ بِهِ الْمُخَالِفُ مِنَ الْقِيَاسِ عَلَى الصَّلَاةِ وَالصِّيَامِ؛ فَفَاسِدٌ، لِأَنَّهُ فِي مُقَابَلَةِ النَّصِّ، ثُمَّ إِنَّ بَيْنَهُمَا فُرْقَانًا؛ وَهُوَ أَنَّ الصَّلَاةَ وَالصَّوْمَ عِبَادَاتٌ مُخْتَصَّةٌ بِالْفَاعِلِ، وَتَعْلِيمُ الْقُرْآنِ عِبَادَةٌ مُتَعَدِّيَةٌ لِغَيْرِ الْمُعَلِّمِ، فَتَجُوزُ الْأُجْرَةُ عَلَى مُحَاوَلَتِهِ النَّقْلَ، كَتَعْلِيمِ كِتَابَةِ الْقُرْآنِ“۔(۱)

قیاس فاسد ہونے کی مزید تشریح

اگر عبادت ایسی ہو کہ جس کا فائدہ دوسروں کو بھی ہو جیسے کہ قرآن کریم کے ذریعے دم

(۱) الجامع لأحكام القرآن تفسير القرطبي ۱: ۳۳۵/، دار الكتب المصرية، القاهرة

کرنا، یا قرآن کریم کی تعلیم دینا، یا حدیث کی تعلیم دینا تو جمہور علمائے کرام کے ہاں ایسی عبادت پر اجرت لینا جائز ہے، اور جو شخص قرآن کریم کی تعلیم کو روزے وحج پر قیاس کرتا ہے اُس کا قیاس فاسد ہے یعنی شیطانی قیاس ہے؛ کیونکہ یہ قیاس نص کے مقابلے میں ہے، پھر دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے، وہ اس طرح کہ روزہ وحج اپنے کرنے والے کو فائدہ پہنچاتے ہیں، جبکہ قرآن کریم کی تعلیم سے دوسروں کو فائدہ ہوتا ہے اور یہ متعدی عبادت ہے، لہذا قرآن کریم پڑھانے پر اجرت لینا جائز ہے؛ کیونکہ وہ بھی قرآن کو دوسروں تک پہنچارہا ہے جیسے کہ قرآن کریم لکھنے کی اجرت لینا جائز ہے۔

حاصل یہ کہ کتاب وسنت میں کوئی بھی ایسی دلیل نہیں ہے جو کہ صراحت کے ساتھ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے والی عبادت کے نتیجے میں اجرت لینے کو حرام قرار دیتی ہوں، اور آیات اس اجرت لینے کو حرام قرار دینے میں صریح نہیں ہیں، بلکہ ان آیات کو دلیل بنانے میں بھی اختلاف ہے۔

بینکاری کو امامت پر قیاس کرنا غلط ہے

ائمہ کرام اور مؤذنین کا بھی گھر بار ہے ان کو بھی اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنا ہے؛ لیکن نماز تو ہر مسلمان پر فرض ہے تو اس کے ذریعہ بیوی بچوں کا پیٹ پالنا کس طرح درست ہے؟ ورنہ بینکار بھی تو یہی عذر پیش کرتے ہیں کہ ہمیں بھی اہل وعیال کو پالنا ہے؛ لیکن ان کا عذر آج تک قبول نہیں کیا گیا حتی کہ اسلامی بینکاری میں بھی قبول نہیں ہوا جس کے حلال ہونے پر فتوی دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ آج کل جو بے روزگاری ہے اس صورت میں بندہ کہاں جائے، اگر مجبوری کی وجہ سے امامت کی تنخواہ جائز ہے تو بینک کی نوکری کی تنخواہ بھی جائز ہونا چاہئے؟۔

جواب: واضح رہے کہ بینک کا موجودہ نظام سود پر مبنی ہے اور سود لینا اور دینا اور اس کا حساب وکتاب کرنا اور اس کا گواہ بننا حرام ہے، قرآن وحدیث میں نہایت سختی کے

ساتھ سود دلین دین سے منع فرمایا ہے، حتیٰ کہ ایسا کام کرنے والوں کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ کی وعید بھی آئی ہے، اس لیے اس میں کسی طرح تاویل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، اس لیے کہ سود کی حرمت کا مسئلہ نص قطعی سے ثابت ہے اور جو مسائل نص قطعی سے ثابت ہوں ان میں تاویل کی ہرگز گنجائش نہیں؛ لہٰذا حدیث کی رو سے بینکاری حرام ہے؛ لیکن بیروزگاری کو علت قرار دیں تو ایسی تاویل اور علت قابل قبول نہیں ہوگی جب سود کا حرام ہونا ثابت ہوگیا اور تمام بینکوں کے نظام سودی ہونا بھی معلوم ہے تو پھر بینک ملازمت کرنا اسی طرح بینک سے ملنے والی تمام مراعات وغیرہ سب ناجائز ہیں، اور اذان اور امامت کے مسئلے پر سود کے مسئلے کا قیاس کرنا درست نہیں ہے، دونوں میں بہت تفاوت ہے، پہلی وجہ: سود کی حرمت نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے جبکہ اذان اور امامت کے مسئلے میں نصوصِ قطعیہ حرمت پر موجود نہیں، اور نہ اس پر ایسی کوئی وعید صادر ہوئی ہے، بل کہ بہت سے دلائل اجرت کے جواز پر ہیں۔

دوسرا جواب: دین کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والوں کا وظیفہ بھی بیت المال سے مقرر تھا (مگر سود کسی بھی صورت میں جائز نہیں تھا) اسی لیے تمام دینی امور منظم طریقے پر انجام پاتے چلے آرہے ہیں۔

تیسرا جواب: اگر کوئی شخص انہی طاعات میں اپنے آپ کو مشغول کرے تو اس شخص کے لیے اپنی حاجات وضروریات کو پورا کرنے کے لیے دیگر ذرائع معاش کو اپنانا مشکل ہوجاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر دیگر ذرائع معاش کو اپنائے گا تو پھر ان طاعات کو مستقل پابندی کے ساتھ بجالانا مشکل ہے تو ایسے حالات میں اگر فقہائے متقدمین کے فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے ان طاعات پر اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا جائے تو دین کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا تو ابقائے دین کی خاطر ایسے طاعات جن پر دین کی

بقاء موقوف ہو ان پر اجرت لینا جائز ہے، مثلاً امامت، موذن، تدریس، قضاء، منصب افتاء؛ جبکہ بینکی نظام پر ابقائے دین موقوف نہیں ہے۔

عثمانی فرقے کا اعتراض اور جواب

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلہ میں چند (عثمانی فرقے کے) لوگ اس بات کی تبلیغ کر رہے ہیں کہ نماز پڑھانے، یعنی امامت اور اسی طرح دیگر دینی امور کی تنخواہ وصول کرنا حرام ہے اور استدلال کے طور پر قرآن مجید سے یہ آیت پیش کرتے ہیں: "وَلَا تشتروا بآیاتی ثمناً قلیلًا۔ الآیۃ" اور انہوں نے کافی لوگوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کا مکمل وضاحت فرمائیں، تاکہ لوگوں کی تشویش اور نفرت ختم ہو جائے۔

الجوابُ حامِداً وَمُصلیاً

قرونِ اولیٰ سے لیکر اسلامی خلافت کے اختتام تک ائمہ، مدرسین، مؤذنین اور قاضی وغیرہ دینی امور پر مامور حضرات کیلئے بیت المال سے وظائف مقرر تھے، اگر دینی امور پر اجرت لینا ناجائز ہوتا تو صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کبھی اس کا ارتکاب نہ کرتے، اور خلفائے راشدین کا عمل امت کیلئے مشعل راہ ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے "علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین" (۱) کہ میرے اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کو لازم پکڑو، اس کے علاوہ بھی دینی امور پر اجرت لینا صحیح اور صریح احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے، اس لئے اب بھی باتفاق ائمہ مجتہدین کے، ان ذمہ داریوں کی اجرت لینا جائز ہے جس کی بناء پر اس کے حاملین دوسرے دنیوی امور انجام دینے سے قاصر ہیں۔

مخالفین جس آیت کو مذکورہ اجرت کے عدم جواز پر بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں، اس آیت کے سیاق وسباق میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ اجرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں

(۱) مشکوۃ المصابیح: ۳۰/۱

ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات و احکام میں دنیا کی لالچ اور حرص کی وجہ سے تحریف اور کتمان (یعنی اصل حقیقت کو چھپانے) کے بارے میں نازل ہوئی، جیسا کہ اس کے بعد والی آیت ''و لا تلبسوا الحق بالباطل و تکتموا الحق و انتم تعلمون'' (۱) سے واضح ہو رہا ہے۔

صاحب روح المعانی کا بیان

مذکور آیت کے تحت تفسیر روح المعانی میں ہے: بعض اہلِ علم نے اس آیت سے کتاب اللہ اور علمِ دین کی تعلیم پر اجرت کے ناجائز ہونے پر استدلال کیا ہے، حالانکہ ان کے دعویٰ پر اس آیت میں کوئی دلیل نہیں۔

''و قد استدل بعض اهل العلم بالآية على منع جواز أخذ الأجرة على تعليم كتاب الله تعالى و العلم، (الى قوله) و لا دليل فى الآية على ما ادعاه اھ (۲)

صاحب ابن کثیر کا بیان

تفسیر ابن کثیر میں ہے:

و لا تشتروا بآياتي ثمناً قليلا﴾ يقول: لاتعتاضوا عن الايمان بآياتي و تصديق رسولي بالدنيا و شهواتها اھ (۳)

میری آیات پر ایمان لانے اور میرے رسول کی تصدیق کرنے کے عوض میں تم دنیا اور اس کی لذتوں کو مت لو۔

---

(۱) البقرة: ۴۲

(۲) روح المعانی ۱/ ۲۴۷

(۳) ابن کثیر: ۱/ ۱۱۴

محدثین کی روایات

ذیل میں ایک دو روایتیں نقل کی جارہی ہیں جو تعلیمِ قرآن پر اجرت لینے میں صریح ہیں، ملاحظہ ہو:

(۱)۔ ففی صحیح البخاری :فقال رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم– ان احق مااخذتم علیہ اجراً، کتاب اللہ"(۱)

ترجمہ: جن کاموں پر تم اجرت، لیتے ہو ان میں سے کتاب اللہ (کی تعلیم وتعلم) پر سب سے زیادہ اجرت لینے کا حق ہے۔

(۲)۔ "و فی نصب الرایة :ان عمر بن الخطاب کتب الیٰ بعض عمالہ ان اعط الناس علیٰ تعلیم القرآن اھ"(۲)

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض عاملوں کو لکھا کہ جو لوگ قرآن کریم کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں، ان کو وظائف جاری کرو۔

چنانچہ مذکورہ بالانصوصِ شرعیہ اور تفسیر قرآن کی روشنی میں امامت وخطابت اور تعلیمِ قرآن پر مامور حضرات کا اپنے مشغولیَ اوقات کی بناء پر وظیفہ اور تنخواہ وغیرہ کا لینا اور انہیں دینا ہر دو امور شرعاً جائز اور درست ہیں، اس میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں، لہٰذا مذکورفرقہ کا آیاتِ قرآن کریم کی غلط تفاسیر بیان کرکے عوام میں اختلاف و انتشار پھیلانا قطعاً درست نہیں ،اور نہ ہی کسی مسلمان کی شان کے لائق ہے، اس لئے ان پر لازم ہے کہ اپنے مذکور ناجائز اور غلط طرزِ عمل سے احتراز کریں، ورنہ بروزِ قیامت باز پرس سے سبکدوشی نہ ہو سکے گی۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب(۳)

---

(۱)صحیح بخاری ۲: ۸۵۴/

(۲)نصب الرایۃ: ۴/ ۱۳۷

(۳)دار الافتاء جامعہ بنوریہ عالمیہ

عدم جواز کی روایت سے استدلال درست نہ ہونے کا خلاصہ

جن بعض آیات و احادیث سے تعلیم قرآن، اذان، امامت اور درس و تدریس پر اجرت کے عدم جواز پر استدلال کیا جاتا ہے، وہ درج ذیل وجوہ کی بناء پر ممانعت میں صریح و متعین المعنیٰ نہیں ہیں:

۱) اگر ممانعت میں صریح ہوتیں تو حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور حضرات ائمہ ثلاثہ، جمہور علماء کرام اور متاخرین فقہاء احناف رحمہم اللہ ان کے خلاف جواز کا توئی کبھی صادر نہ فرماتے۔

۲) یہ ممانعت اس کے لئے ہے جس کا مقصد ان امور دینیہ سے دنیا کمانا ہو اور ان کو کسب معاش کا پیشہ بنایا ہو، جس کا مقصد تعلیم و تدریس سے دین کی اشاعت و تبلیغ ہو، اس کے لئے ممانعت نہیں۔

اس کے مطابق حضرت حکیم الامت قدس سرہ فرماتے ہیں: بعض لوگ ان امور دینیہ پر تنخواہ لے کر دین کو دنیا بنا رہے ہیں اور بعض تنخواہ لے کر دنیا کو دین بنا رہے ہیں، اگر درس و تدریس اور تعلیم قرآن سے مقصود مال حاصل کرنا ہے، تو اس نے دین کو حقیر دنیا کمانے کا ذریعہ بنا کر اس کو دنیا بنا دیا، اور جو ان امور پر خواہ اس لئے لے رہا ہے کہ تا کہ دلجمعی کے ساتھ باحسن وجوہ یہ کام سرانجام دینے سکے تو اس نے دنیا کو دین بنا دیا، کیونکہ یہ تنخواہ اس لئے لے رہا ہے، تاکہ دین کی خدمت کرسکوں، ورنہ دنیا کمانے میں لگ گیا، تو دین کی خدمت چھوٹ جائے گی۔

۳) تعلیم و تدریس کا معاوضہ نہیں، بلکہ جس اوقات کا معاوضہ ہے، جو جائز ہے۔

۴) ان احادیث میں سے اکثر ضعیف ہیں، اگر کچھ روایات صحیح بھی ہوں، تو وہ موؤل یا منسوخ ہیں۔(۱)

(۱) بحوالہ: ملازم و ملازمت کے شرعی احکام: ۱۴۷

ذمہ داران سے متعلق اہم امور و مسائل

تنخواہوں میں کمی کے منفی اثرات

آج ایسے کئی افراد کو شمار کیا جا سکتا ہے جو اس قابل تھے کہ وہ علمی میدان کے شہسوار ہوتے تو گراں قدر کارنامے انجام دے سکتے؛ لیکن اسی تنخواہوں کے عدمِ توازن نے انھیں اس راہ کو خیر باد کہنے پر مجبور کر دیا؛ بلکہ بعضے طلبہ ابتداء ہی سے یہ ذہن بناتے ہیں کہ فراغت کے بعد دوسری لائن کو اختیار کرنا ہے، یورپی ملک یا کسی خلیجی ملک کا سفر کرنا ہے، ورنہ مدارس ومساجد کی تنخوہوں پر گزبسر کیسے ممکن ہے؟ نیز علمی کاموں کے لیے یکسوئی درکار ہوتی ہے؛ لیکن جب ایک شخص کو وسائل ہی میں مصروف کیا جائے گا اور اسی کی فکر میں اس کی صبح وشام ہوگی تو وہ علمی کام کے لیے کب اپنے آپ کو فارغ کرے گا؟ یہی وجہ ہے کہ آج علم وتحقیق کے میدان کے شہسواروں کی روز بہ روز قلت ہوتی جارہی ہے، اور قابل افراد کی ناقدری تحقیقی کام کے لیے سمِ قاتل بنتی جارہی ہے، اگر ذمہ دارانِ مدارس اس مقام پر غور کریں اور اساتذہ کی قدردانی کریں اور انھیں وسائل سے مستغنی کرنے کی سعیِ مسعود کریں، انھیں معاشی تنگیوں سے آزاد کرنے وچھٹکارا دلانے کی کوشش کریں اور تحقیقی وتصنیفی کام اور افراد سازی کی جانب ان اساتذہ کی توجہ مبذول کریں تو کیا آج گزشتہ تاریخ نہیں دہرائی جا سکتی؟ تعلیم وتدریس میں کمی وکوتاہی کا ایک بنیادی سبب تنخواہوں میں عدم توازن بھی ہے، ہر ذمہ دار کی دلی خواہش ظاہراً یہ ہوتی ہے کہ تعلیم میں ترقی ہو، ان کا مدرسہ علاقہ کا مثالی مدرسہ بنے، ان کی جانب بچوں کا رجوع بڑھتا چلا جائے، ان کی تعلیم کا ہر جگہ چرچا ہو، یہ باتیں اور خیالات تو دلفریب ہیں؛ لیکن اس کے لیے مطلوبہ محنت ندارد، مطلوبہ وسائل کا استعمال نہیں، جس کے نتیجے میں اساتذہ طلبہ پر محنت کرنے سے قاصر ہیں اور وقتی طور پر ایک آدھ اردو شرح پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے، بالآخر نا کارہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد ان مدارس سے فارغ ہو کر عوام تک پہنچ رہی ہے، جو دینی خدمت کے قابل نہیں ہوتی۔

ذمہ داروں کی خوش حال زندگی

یہ بات بالکل بجا اور اپنے مقام پر درست ہے کہ ہمارے اکابر نے کبھی دینی خدمت کے لیے تنخواہوں کو معیار نہیں بنایا؛ بلکہ بعض ایسے واقعات بھی ہیں کہ ذمہ دار نے تنخواہ میں اضافہ کیا تو اساتذہَ کرام نے اضافہ قبول کرنے سے انکار کر دیا؛ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب ضروریات کم ہوتی تھیں اور مہنگائی کا یہ عالم نہ تھا اور جب استاذ اور ذمہ دار دونوں کی زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا تھا، اکابر کی صف میں سب کی طرزِ رہائش ایک تھی، مدرس و مہتمم دونوں سادگی کے حامل ہوتے، حضرت نانوتویؒ ذمہ دار بھی ہیں؛ لیکن سادگی میں اپنی مثال آپ ہیں، حضرت خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ ذمہ دار ہیں، اس کے باوجود فاقہ کی وجہ سے غشی طاری ہو رہی ہے، باوجود یہ کہ ذمہ دار ہیں، گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا، اگر یہی کیفیت آج بھی پیدا ہو کہ ذمہ دار بھی بھوکے ہوں تو اساتذہ بھی بھوک برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں؛ لیکن یہاں تو معاملہ کچھ الٹا ہے، آج ذمہ دارانِ مدارس کے اخراجات کا جائزہ لیا جائے تو نت نئے ملبوسات، قسم قسم کے جوتے، ہمہ وقت ہزاروں روپے جیب میں موجود اور رنگ برنگے فونوں سے ہاتھ مزین، گویا ان کی زندگی ہی وسعت و فراخی سے تعبیر ہے، ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ آپ نے ابتداءً تنگی و عسرت کی زندگی بسر کی ہے، آپ کے ابتدائی ایام بڑے پریشان کن رہے؛ لیکن کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اوروں کو بھی پریشانی سے دو چار کیا جائے؟

تنخواہ کا توازن درست کریں

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ذمہ دارانِ مساجد و مدارس حقائق سے آگاہ ہوں، حالات سے باخبر ہوں، تنخواہ میں توازن پیدا کریں، اور ایسی مقدار مقرر کریں کہ جس سے

ایک متوسط خاندان بہ آسانی اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کر سکے اور تنخواہوں میں اضافہ کے ذریعہ خدامِ دین کو وسعت و فراخی اور آزادی کے ساتھ کام کے مواقع عطا کریں، اور اتنی تنخواہ ہو کہ انھیں ذہنی سکون و یکسوئی حاصل ہو جائے، جو کسی بھی دینی خدمت کے لیے ناگزیر ہے۔(۱)

تنخواہ کی مقدار کیا ہو؟

مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مزدوری پوری نہ دینے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں کہ اس کی مزدوری مارلے اور پوری نہ دے؛ بلکہ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ جتنی اجرت اس کام کی ملنی چاہیے اتنی نہ دے، اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے کہ کم سے کم اجرت پر کام لے، فقہاء کرام نے تصریح کی ہے:

”وَيُعْطِيْ بِقَدْرِ الْحَاجَةِ وَالْفِقْهِ وَالْفَضْلِ فَاِنْ قَصَرَ كَانَ اللهُ عَلَيْهِ حَسِيْبًا“

یعنی متولی اور مدرسہ کے مہتمم کو لازم ہے کہ خادمانِ مساجد و مدارس کو ان کی حاجت کے مطابق اور ان کی علمی قابلیت اور تقویٰ و صلاح کو ملحوظ رکھتے ہوئے وظیفہ، مشاہرہ اور تنخواہ دیتے رہیں، باوجود گنجائش کے کم دینا بُری بات ہے اور متولی و مہتمم خدا کے حضور جواب دہ ہوں گے۔(۲)

حضرت مفتی صاحب نے متولی و مہتمم حضرات کی توجہ شدت سے اس جانب مبذول کرائی ہے کہ مدرس و امام کو ان کی حاجت و ضرورت کے مطابق تنخواہ دیں، اس میں کسی بھی طرح کی کمی ظلم کے مترادف ہے اور کمی کرنے والوں کو خدا کے حضور جواب دہی سے ڈرنا چاہیے۔

---

(۱) ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ 5، جلد 98: رجب 1435 ہجری مطابق مئی 2014ء

(۲) فتاوی رحیمیہ: ۴/ ۱۳۸

تنخواہ کے اضافہ کا معیار کیا ہو؟

معاشرے میں مساجد اور ائمہ دونوں کا کردار نہایت اہم رہا ہے، مساجد کے ذریعہ معاشرے کو صحیح رخ پر ڈھالنے کی ذمہ داری ائمہ نے سرانجام دی ہے۔ لہذا مساجد اور ائمہ مساجد دونوں مسلمانوں کی اہم دینی ضروریات میں سے ہیں۔ مساجد میں باصلاحیت افراد کا تقرر اور ان کی صلاحیتوں، معاشی ضروریات اور ضروریات زندگی کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کو مدنظر رکھ کر ان کے لیے معقول وظیفہ مقرر کرنا مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ ائمہ مساجد، موذنین اور خدام کے وظائف میں وقتاً فوقتاً مہنگائی کی شرح اور ان کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب شرح کے ساتھ اضافہ بھی لازمی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مساجد کے ائمہ، مؤذنین اور خدام کے وظائف ان کی صلاحیتوں، معاشی ضروریات اور مہنگائی کی شرح کو سامنے رکھتے ہوئے طے کرنے چاہئیں اور ان ہی امور کو مدنظر رکھ کر وقتاً فوقتاً ان وظائف میں معقول اضافہ بھی کرنا چاہیے۔

تنخواہ کی تعیین میں عام اجیر کی حیثیت نہ ہو

مساجد سے منسلک افراد کے وظائف مقرر کرتے ہوئے ان وظائف کو محض ایک اجیر کی اجرت کے تناظر میں نہ دیکھا جائے بلکہ یہ بنیاد سامنے رکھی جائے کہ یہ افراد معاشرے کی ایک اہم دینی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں، موسم کے تفاوت اور حالات کی تفریق سے قطع نظر ہمہ وقت اپنی ذمہ داری کو نبھانے کی بھرپور سعی کرتے ہیں، لہذا ان سے متعلق یہ جذبہ بھی سامنے رکھا جائے، نیز ان افراد کے معقول وظائف مقرر کرنا اور ان میں اضافہ کرنا یہ اشاعت دین میں حصہ ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسلام میں منصب امامت کی بڑی اہمیت ہے، یہ ایک باعزت باوقار اور باعظمت اہم دینی شعبہ ہے، یہ مصلّی رسول اللہ ﷺ کا مصلّی ہے، امام نائب رسول ہوتا ہے اور امام اللہ

رب العزت اور مقتدیوں کے درمیان قاصد اور ایلچی ہوتا ہے، اس لئے جو سب سے بہتر ہو اسے امام بنانا چاہئے، حدیث میں ہے : اگر تمہیں یہ پسند ہے کہ تمہاری نماز درجہ مقبولیت کو پہنچے تو تم میں جو بہتر اور نیک ہو وہ تمہاری امامت کرے کہ وہ تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان قاصد ہے:

"ان سركم ان تقبل صلوتكم فليؤ مكم علماء كم فانهم وفدكم فيما بينكم وبين ربكم، رواه الطبراني وفي رواية الحاكم فليؤ مكم خياركم وسكت عنه"(۱)

اس سلسلہ میں مسجد کے فنڈ کی بات زیادہ اہمیت کی حامل نہیں، اس لیے کہ مساجد عموماً عوام اور دینی جذبہ رکھنے والے افراد ہی کے تعاون سے چلتی ہیں، ان کے لیے حکومتوں کی جانب سے کوئی فنڈ مختص نہیں ہوتا، بلکہ موقع محل کی مناسبت سے عوام مساجد کے چندہ میں بھرپور حصہ لیتے ہیں، مساجد سے متعلقہ ضروریات کی تکمیل کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں، لہذا اگر کہیں مسجد کے فنڈ کا مسئلہ ہو بھی تو عوام کے سامنے مناسب انداز میں مسجد کی ضروریات رکھی جائیں تو یہ مسئلہ بسہولت ختم ہو جاتا ہے۔

امام کی تنخواہ کے لیے جمع کیے گئے چندہ کو مسجد میں لگانے کا حکم

جو چندہ صرف امام کی تنخواہ کے لیے جمع ہو، چاہے محلہ والے یہ چندہ جمع کریں یا عام لوگ جو جمعہ وغیرہ کے لیے مسجد میں آتے ہیں تو اس سے دو تین ہزار روپے مسجد میں لگانا کیسا ہے؟ جب کہ امام اس پر راضی نہ ہو، اور جتنے سالوں کی تنخواہ کاٹ کر مسجد کے چندہ میں جمع کی گئی ہے اس کا کیا حکم ہے امام کو واپس کرنی ہوگی یا نہیں؟

جواب: واضح رہے کہ چندے کی رقم کا حکم یہ ہے کہ چندے کی رقم جس مد کے لیے جمع

(۱) شرح نقایہ: ۱/۸۶، والاولی بالامامۃ الخ

کی گئی ہو اسی مد میں خرچ کرنا ضروری ہے، اس کے علاوہ مصرف میں خرچ کرنے لیے چندہ دینے والوں کی اجازت ضروری ہے، اگر چندہ دینے والے اجازت دے دیں تو کسی اور مصرف میں اس کا استعمال جائز ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں سائل نے یہ واضح نہیں کیا کہ امام کی تنخواہ ماہانہ مقرر ہے یا نہیں؟ بہر حال اگر مقرر نہیں بلکہ جتنی جمع ہوتی ہے اتنی ہی دی جاتی ہو تو پھر امام کی تنخواہ کی مد کے لیے جمع کیے گئے چندہ کو امام کی تنخواہ میں صرف کرنا ضروری ہے، مذکورہ چندے کو مسجد کی ضروریات میں معطیین کی اجازت کے بغیر خرچ کرنا درست نہیں ہے۔ اور اگر امام صاحب کی ماہانہ تنخواہ مقرر ہے تو اس مقررہ تنخواہ سے زائد چندہ ہو تو زائد رقم کے حق دار چوں کہ امام صاحب نہیں؛ اس لیے زائد رقم روکنا مسجد کمیٹی کے لیے جائز ہے، پھر جس ماہ میں امام کی تنخواہ کی مد میں رقم کم آئے اس ماہ کے ساتھ مذکورہ زائد رقم شامل کر کے ماہانہ تنخواہ پوری کر دی جائے، مقررہ تنخواہ سے کٹوتی کر کے امام مسجد کی رضامندی کے بغیر جو رقم مسجد میں خرچ کی گئی ہے وہ امام کو واپس کرنا ضروری ہے۔

فتاوی شامی میں ہے:

"قال الخير الرملي :أقول :ومن اختلاف الجهة ما إذا كان الوقف منزلين أحدهما للسكنى والآخر للاستغلال فلا يصرف أحدهما للآخر وهي واقعة الفتوى"(۱)

امام کی تنخواہ پندرہ ہزار روپے سے کم ہونے کی صورت میں اقتدا کا حکم

میں نے گزشتہ دنوں سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو کلپ سنا جس میں ایک عالم دین فرما رہے تھے کہ جس مسجد کے نمازی اپنے امام کو ماہانہ پندرہ ہزار روپے سے کم تنخواہ دیں تو

(۱) کتاب الوقف، مطلب فی نقل انقاض المسجد ونحوہ: ۴/ ۳۶۱، ط: ایچ، ایم، سعید، بحوالہ: دارالافتاء : جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن، فتوی نمبر: 144311101573

ان مقتدیوں کی نماز اس امام کے پیچھے جائز نہیں ۔کیا یہ درست ہے؟

جواب: امام کی تنخواہ اتنی ہونی چاہیے کہ جس سے اُس کی ضروریات تنگی اور محتاجی کے بغیر پوری ہو جائیں اور اس کو یکسوئی حاصل رہے، علاقے کی نوعیت کے اعتبار سے اس کی مقدار مختلف ہوسکتی ہے اور تنخواہ کے نظم کی ذمہ داری جس طرح مسجد کمیٹی کی ہے، اسی طرح نمازیوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ تنخواہ کے اخراجات کے لیے حسب وسعت تعاون کریں۔

صورت مسولہ میں یہ بات درست نہیں کہ پندرہ ہزار تنخواہ سے کم تنخواہ والے امام کے پیچھے مقتدیوں کی نماز جائز نہیں نماز بہرحال درست ہے تاہم امام مسجد کی ضروریات کے لحاظ سے مناسب مقدار میں تنخواہ مقرر کرنی چاہیے۔

"ویعطي بقدر الحاجة والفقه والفضل فإن قصر كان الله عليه حسيبا زيلعي۔۔۔ (قوله ويعطي بقدر الحاجة إلخ) الذي في الزيلعي هكذا، ويجب على الإمام أن يتقي الله تعالى ويصرف إلى كل مستحق قدر حاجته من غير زيادة فإن قصر في ذلك كان الله تعالى عليه حسيبا. اهـ"(۱)

وقف بورڈ سے ائمہ مساجد کی تنخواہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ: ائمہ مساجد کے لئے وقف بورڈ سے تنخواہوں کی منظوری حال ہی میں آچکی ہے، تو کیا شرعاً اس تنخواہ میں کوئی قباحت ہے؟

باسمہٖ سبحانہ تعالیٰ؛ الجواب و باللّٰہ التوفیق: اَوقاف کے مصارف میں اگر ائمہ کی

(۱) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الجهاد، مطلب في مصارف بيت المال ۶: ۳۵۲/، بحواله: دارالافتاء جامعہ عثمانیہ پشاور، فتویٰ نمبر 9286 :/321/297

تنخواہوں میں خرچ کا بھی ذکر ہے، تو ان کے ذریعہ مساجد کے ائمہ کو تنخواہ لینا درست ہے۔ ”علی أنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة“۔(۱)

گولک کے ذریعہ وصول شدہ رقم سے امام کی تنخواہ دینا؟

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ : مسجد کے گولک میں جو پیسہ جمع ہوتا ہے، اُس سے امام صاحب کی تنخواہ دینا کیسا ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟ شرعی مسئلہ سے آگاہ فرمائیں۔

باسمہٖ سبحانہ تعالیٰ؛ الجواب وباللّٰہ التوفیق : مسجد کے گولک میں جو لوگ پیسہ ڈالتے ہیں، اُن کا مقصد مسجد کی تمام ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے؛ لہٰذا گولک کے پیسے سے امام صاحب کی تنخواہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

”ثم إلى ما هو أقرب إلى العمارة أعم للمصلحة كالإمام للمسجد والمدرس للمدرسة يصرف إليهم إلى قدر كفايتهم“۔(۲) ”ويبدأ من غلته بعمارته، ثم ما هو أقرب لعمارته كإمام مسجد ومدرس مدرسة يعطون بقدر كفايتهم“۔(۳)

تنخواہ دار امام کا وقف بورڈ سے بھی تنخواہ لینا درست ہے؟

سوال: ایک مسئلہ درپیش ہے کہ امام صاحب کی تنخواہ 14 ہزار اہل کمیٹی کی طرف سے مقرر ہے لیکن اب وقف بورڈ کی طرف سے بھی 14 ہزار ملنے لگے ہیں تو ایسی

---

(۱) شامی، کتاب الوقف/ مطلب: مراعاة غرض الواقفین واجبة والعرف یصلح مخصصًا ۶/ ۶۶۵ زکریا، ۴/ ۴۴۵ کراچی، ماخذ: کتاب النوازل: ۱۳/ ۳۲۰

(۲) الفتاویٰ الہندیة/ الباب الثانی من کتاب الوقف ۲/ ۳۶۸ زکریا

(۳) شامی، کتاب الوقف/ مطلب: یبدأ بعد العمارة بما ہو أقرب إلیها ۶/ ۵۶۰ زکریا، ماخذ: کتاب النوازل: ۱۳/ ۳۲۰

صورت میں کیا امام کو دونوں تنخواہ لینی جائز ہوگی ایسی صورت میں کیا کیا جائے ہمارے یہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اب مسجد کی طرف سے تنخواہ روک دی جائے بس چودہ ہزار سرکار جو دے رہی ہے وہی رہنے دیں اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ امام صاحب کا نصیب ہے پورے 28 ہزار ہی دیں اور کچھ لوگ کہتے ہیں مسجد کی تعمیر بھی نہیں ہوئی ہے ایسا کیا جائے امام صاحب کو 20 ہزار دئے جائیں اور باقی پیسے بچائیں جائیں مفتیان کرام قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں عوام میں بڑا جھگڑا فساد ہو رہا ہے۔

الجواب :اس بارے میں عوام کا جھگڑا فضول ہے،صورت مسئولہ میں امام صاحب کی جو تنخواہ منجانب مسجد،مقرر ہے اُسے بحال رکھی جائے اور سرکاری وظیفہ قبول کرنے سے احتیاط کی جائے، ہمارے اکابر نے دینی مدارس کے لئے سرکاری امداد کو پسند نہیں فرمایا۔اس کے پیش نظر احتیاط اسی میں ہے کہ مساجد کے ائمہ کے لئے بھی لینے سے بچا جائے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔(۱)

عاجزِ مرتب کی رائے یہ ہے کہ تقرری کے وقت اصل معاملہ مسجد کی انتظامیہ سے ہوتا ہے، وہی تنخواہ معتبر ہے، وقف بورڈ سے تنخواہ ملنے میں مسجد کی انتظامیہ کا دخل نہیں ہے،اور وقف بورڈ کی تنخواہ پابندی سے بھی نہیں ملتی ہے،اس لئے انتظامیہ اپنا معاملہ صاف اور مضبوط رکھے،اگر وقف بورڈ سے تنخواہ آتی ہے تو چونکہ وقف بورڈ امام ومؤذن کو تنخواہ کی کمی کی وجہ سے ہی یہ نظام شروع کیا ہے تو وہ رقم بھی دیدی جائے،وقف بورڈ کو پہلے سے پتہ ہے کہ مساجد کی کمیٹیاں تنخواہیں کم دیتی ہیں،اس تنخواہ میں اضافہ کی خاطر ہی وقف بورڈ کا یہ تعاون ہے لہٰذا مسجد مکمل تنخواہ یعنی انتظامیہ کی طرف سے طے شدہ اور وقف بورڈ کی مکمل ادا کردے۔واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند، Fatwa:522-481/M=06/1441، جواب نمبر: 176394

امام کی تنخواہ کے لیے جمع کیے گئے چندہ کو مسجد میں لگانے کا حکم

سوال: جو چندہ صرف امام کی تنخواہ کے لیے جمع ہو، چاہے محلہ والے یہ چندہ جمع کریں یا عام لوگ جو جمعہ وغیرہ کے لیے مسجد میں آتے ہیں تو اس سے دو تین ہزار روپے مسجد میں لگانا کیسا ہے؟ جب کہ امام اس پر راضی نہ ہو، اور جتنے سالوں کی تنخواہ کاٹ کر مسجد کے چندہ میں جمع کی گئی ہے اس کا کیا حکم ہے امام کو واپس کرنی ہو گی یا نہیں؟

جواب: واضح رہے کہ چندے کی رقم کا حکم یہ ہے کہ چندے کی رقم جس مد کے لیے جمع کی گئی ہو اسی مد میں خرچ کرنا ضروری ہے، اس کے علاوہ مصرف میں خرچ کرنے لیے چندہ دینے والوں کی اجازت ضروری ہے، اگر چندہ دینے والے اجازت دے دیں تو کسی اور مصرف میں اس کا استعمال جائز ہوگا۔

لہذا صورتِ مسئولہ میں سائل نے یہ واضح نہیں کیا کہ امام کی تنخواہ ماہانہ مقرر ہے یا نہیں؟ بہر حال اگر مقرر نہیں بلکہ جتنی جمع ہوتی ہے اتنی ہی دی جاتی ہو تو پھر امام کی تنخواہ کی مد کے لیے جمع کیے گئے چندہ کو امام کی تنخواہ میں صرف کرنا ضروری ہے، مذکورہ چندے کو مسجد کی ضروریات میں معطیین کی اجازت کے بغیر خرچ کرنا درست نہیں ہے۔ اور اگر امام صاحب کی ماہانہ تنخواہ مقرر ہے تو اس مقررہ تنخواہ سے زائد چندہ ہو تو زائد رقم کے حق دار چوں کہ امام صاحب نہیں؛ اس لیے زائد رقم روکنا مسجد کمیٹی کے لیے جائز ہے، پھر جس ماہ میں امام کی تنخواہ کی مد میں رقم کم آئے اس ماہ کے ساتھ مذکورہ زائد رقم شامل کر کے ماہانہ تنخواہ پوری کر دی جائے۔ مقررہ تنخواہ سے کٹوتی کر کے امام مسجد کی رضامندی کے بغیر جو رقم مسجد میں خرچ کی گئی ہے وہ امام کو واپس کرنا ضروری ہے۔

”قال الخير الرملي :أقول :ومن اختلاف الجهة ما إذا كان

الوقف منزلين أحدهما للسكنى والآخر للاستغلال فلا يصرف أحدهما للآخر وهي واقعة الفتوى. اهـ"(۱) فقط واللہ اعلم۔(۲)

علماء کرام کا بیانات کے عوض رقم لینا

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام ان علماء کرام کے بارے میں جو اپنے بیان وتقریر کا خرچ لیتے ہیں؟ کیا اس طرح کا کوئی نظام آپ علیہ السلام کے دور میں یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے دور میں ملتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

سوال نمبر-(۲) ام طور پر جو انجمن اور تنظیم جلسہ وجلوس کراتی ہے وہ جن علماء کرام کو اپنے یہاں اجلاس میں بیان وتقریر کا موقع دیتے ہیں اور انہیں عوام سے چندہ اکٹھا کر کے جو بڑی بڑی رقوم دیتے ہیں وہ علماء کرام اپنے یہاں بھی اجلاس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں اور پھر ان کا بھی اس سے بہتر استقبال کیا جاتا ہے گویا کہ یہ علماء کرام کی ایک تجارت ہو رہی ہے۔ کیا ایسی تجارت کرنا جائز ہے؟

سوال نمبر-(۳) اگر یہ رقوم کرایہ کے نام پر لی جارہی ہیں تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ علماء کرام جو اپنے کام کے لیے اگر سفر کرتے ہیں تو ٹرین کے سلیپر کلاس سے کرتے ہیں اور کسی جلسے میں انہیں مدعو کیا جاتا ہے تو ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

سوال نمبر-(۴) کیا مقامی علماء کرام اس جلسہ وجلوس کے لیے کافی نہیں ہیں؟

سوال نمبر-(۵) ان تنظیم وانجمن سے عوام جلسے وجلوس کے حساب وکتاب کا

(۱) فتاوی شامی، کتاب الوقف، مطلب فی نقل انقاض المسجد ونحوہ: ۴/ ۳۶۱، ط: ایچ، ایم، سعید

(۲) دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن، فتوی نمبر: 144311101573

مطالبہ کرسکتی ہے یا نہیں؟ کیا اس طرح کے جلسے وجلوس کا انعقاد حضور اکرم صلعم کے زمانے میں ہوتا تھا؟ ہر ایک سوال کا جواب مدلل ومفصل عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم؛ جواب:

(۱) وعظ پر اجرت لینے کو متأخرین علماء نے جائز لکھا ہے اس لیے وعظ پر متعارف اجرت لینے میں مضایقہ نہیں، اور چونکہ خیر القرون میں علماء قراء واعظین وغیرہ کے وظائف بیت المال سے مقرر ہوتے تھے، اس لیے خاص اس سلسلے میں خیر القرون میں کسی فنڈ کا ہونا ضروری نہیں، البتہ عموم سے استدلال کیا جاسکتا ہے، اسی بنا پر فقہاء متأخرین نے دیگر طاعات امامت، اذان، تعلیم کی اجرت کو جائز لکھا ہے۔

(۲) اگر آنے جانے سے ایک دوسرے میں ربط اور محبت پیدا ہو جانے کی وجہ سے اجلاسوں میں ایک دوسرے کو اپنے یہاں مدعو کرتے ہوں تو مضائقہ نہیں؛ البتہ محض روپئے کے حصول یا دیگر اغراضِ فاسدہ کی بنا پر ایک دوسرے کو مدعو کرنا نامناسب ہے اس سے احتراز ضروری ہے والاَمور بمقاصدہا۔

(۳) اگر کسی خاص وجہ سے جانے والا ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا مطالبہ کرتا ہے مثلاً: وقت کی تنگی ہے وغیرہ تو اس میں حرج نہیں، ورنہ بلا ضرورت اس کا مطالبہ مناسب نہیں چندہ کی رقمیں قوم کی امانت ہوتی ہیں جن میں احتیاط سے کام لینا ہر ایک پر ضروری ہے۔

(۴) کیوں نہیں! مقامی علماء بھی اس کے لیے کافی ہو سکتے ہیں، البتہ بالعموم مقامی علماء کی قدر وہاں کے عوام کے دلوں میں نہیں ہوتی ہے، اس لیے باہر سے علماء کے بلانے کا رواج ہے۔

(۵) ہر ایک کو تو حساب وکتاب کے مطالبہ کا حق نہیں البتہ وہاں کے مقتداء اور بڑے حضرات مطالبہ کرسکتے ہیں اور بہتر یہی ہے کہ چندہ وصول کرنے والے حضرات

ہی چندہ کا پورا حساب تیار کر کے رکھیں تا کہ ہر ایک کو دکھایا جاسکے۔

(۶) مروجہ طرز پر جلسہ جلوس کا انعقاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہیں تھا البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بوقتِ ضرورت وحسب احوال وقتاً فوقتاً اپنے اصحاب کو نصائح فرمایا کرتے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔(۱)

(۱) دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند Fatwa ID: 016-238/L=3/1438

اہلِ علم و مدارس سے متعلق چند اہم امور

مدرس اجیرِ خاص ہوتا ہے

مدرس اجیر خاص ہے، اور اجیر خاص تسلیم نفس کا پابند ہوتا ہے، اسی کے مطابق وہ اجرت کا مستحق بنتا ہے، جن دنوں/ اوقات میں کام کرنا طے پایا ہے، اگر ان میں تسلیم نفس نہیں کرے گا تو اجرت کا مستحق نہ ہوگا۔

معروف تعطیلات کا مدرس مستحق ہوتا ہے

جن اوقات/ ایام میں تعطیلات کا ہونا متعارف ہو، ان میں اصل ضابطہ کے مطابق اگر یہ اجرت کا استحقاق نہیں ہوتا کیونکہ تسلیم نفس نہیں ہے، تاہم ان ایام کی اجرت عام طور پر معروف ہوتی ہے، کبھی صراحت کے ساتھ بھی اس کی شرط لگائی جاتی ہے، مشروط یا معروف ہونے کی صورت میں ان دنوں کی اجرت بھی لازم ہوگی۔

ان دونوں صورتوں میں تعطیل کے ایام واوقات کام کے ایام واوقات کے تابع شمار ہوں گے؛ مگر تابع ہونے کے لئے بعد میں ہونا ضروری نہیں۔

مدرس کے ساتھ معاملہ مسانہہ کا ہے یا مشاہرہ کا؟

مدرس کا مدرسہ کے ساتھ اجارہ کا جو عقد ہوتا ہے، وہ مسانہہ ہے یا مشاہرہ؟ اس کا مدار اس بات پر ہے کہ دونوں فریق کے درمیان عقد ہوتے وقت کیا طے پایا؟ اگر تقرری کے وقت سال کی بات طے ہوئی ہو تو مسانہہ ہوگا، اور گر اس وقت مہینہ کی بات ہوئی ہو تو مشاہرہ۔ ہمارے ہاں عام طور پر تقرری کے وقت ہی طے ہو جاتا ہے کہ یہ عقد سال بھر کے لئے ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ”اس سال یا آئندہ سال آپ ہمارے ساتھ تدریس کریں گے“۔ مدارس کا عام عرف وتعامل بھی اسی کا ہے، لہذا اگر کہیں صراحت کے ساتھ سال بھر کے لئے تقرری طے نہ بھی ہو تو بھی عام تعامل کی وجہ سے اس کو ”عقد مسانہہ“ ہی قرار دیا جائے گا۔

البتہ مسانہہ قرار دینے کی صورت میں سال کی ابتداء و انتہاء کب شمار ہوگی؟ سال بارہ مہینوں کا سمجھا جائے گا یا تعلیمی سال نو، دس مہینوں کا قرار دیا جائے گا؟ اس کا دار و مدار اولاً عاقدین کی صراحت پر ہے، اگر وہ نہ ہو تو تعامل و تعارف پر ہے، لہٰذا فریقین کے درمیان اس حوالہ سے اگر واضح طور پر کچھ طے پاتا ہے تو اسی کو راجح سمجھا جائے گا اور ان کے درمیان اگر کچھ طے نہ پائے تو عام دینی مدارس کے عرف و تعامل کو دیکھا جائے گا۔

عقدِ اجارہ لازم ہے

عقد اجارہ عقد لازم ہے، لہٰذا مدت اجارہ میں کسی ایک فریق کے لئے یک طرفہ طور پر اس کو ختم کرنا درست نہیں ہے، البتہ اگر کوئی ایسا معقول عذر پیش آجائے جس کے بعد عقد کو برقرار رکھنا ممکن نہ رہے، یا کسی ایک فریق کے لئے مزید مشکلات کا باعث بن جائے تو اس صورت میں عقد ختم کرنے کی گنجائش ہے، تاہم عملی طور پر اپنی طرف سے عقد کو ختم کرنے کے لئے دوسرے فریق کو اطلاع دینا ضروری ہے، ورنہ تو محض ارادہ کرنے سے عقد ختم ہو گا نہ ہی اس کے احکام ختم ہوں گے۔(۱)

عقدِ لازم بغیر عذر کے ختم کرنے کو قبول کر لینا

کوئی ایک فریق کسی معقول و معتبر عذر کے بغیر از خود عقد ختم نہیں کرسکتا، تاہم اگر وہ اس طرح اقدام کرتا ہے اور دوسرا فریق بھی اس کو تسلیم کرتا ہے تو اس کے ساتھ عقد خود بخود ختم ہو جائے گا، اس صورت میں ایک فریق کا از خود ایسا اقدام کرنا تو درست نہیں تھا لیکن جب دوسرے فریق نے بھی آمادگی دکھائی تو اس کے ساتھ عقد ختم ہو چکا۔

---

(۱) لیکن ایشاء میں تقریباً مدارس میں اجارہ عقد لازم کے طور پر نہیں پیش کیا جاتا ہے، تفصیل آگے آرہی ہے۔

مدرس شعبان اور رمضان کی تنخواہ کا مستحق رہتا ہے

معاہدہ برقرار ہے کوئی مدرس سال بھر تدریس کرتا رہا، شعبان و رمضان میں ادارے کی چھٹی ہے، آئندہ سال شوال سے پھر اسی مدرسہ میں تدریس کا ارادہ ہے، تدریس کا عقد و معاہدہ برقرار ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ چھٹی کے یہ ایام، عمل کے ایام کے تابع شمار ہوں گے اور اس میں بھی مقررہ اجرت لازم ہوگی۔

مدرس کا استعفاء ختمِ سال پر قبول ہونے پر تنخواہ کا مستحق نہیں رہتا

مدرس نے سال کے آخر میں استعفاء دیا، مثال کے طور پر موجودہ ترتیب کے مطابق رجب کے آخر تک تدریس وغیرہ مفوضہ ذمہ داریاں اداء کرتا رہا، اور پھر استعفاء دیا، اس صورت کا حکم یہ ہے کہ شعبان و رمضان کی تنخواہ کا استحقاق نہیں ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ استعفاء دیتے ہی عقد ختم ہوا، اس کے بعد اجرت کے واجب ہونے کی کوئی بنیاد ہی موجود نہیں رہی۔

ایک فقہی اشکال و جواب

اس پر فقہی نقطہ نظر سے یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ جب پہلے سے طے ہے کہ استعفاء کی صورت میں مدرس کو شعبان و رمضان یا صرف شعبان کی تنخواہ ملے گی تو اس صورت میں یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ عقد استعفاء کے وقت سے ختم نہیں ہوا، بلکہ اس کے بعد رمضان یا شعبان کے آخر میں عقد کا فسخ ہونا شمار ہوگا، نیز یہ تاویل بھی بعید نہیں ہے کہ اس ایک یا دو مہینہ جو اجرت دی جارہی ہے، وہ ان ایام کی اجرت قرار نہ دی جائے بلکہ سابقہ مدت کی اجرت کا حصہ قرار دیا جائے جس کا اس مہینہ میں وصول ہونا طے پایا ہے، مثال کے طور پر اگر دس ہزار تنخواہ طے پائی ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ فی ماہ تنخواہ دس نہیں ہے بلکہ بارہ ہزار ہے، البتہ باقی دو، دو ہزار روپے

ہر ماہ وصول نہیں ہوتے بلکہ شعبان و رمضان میں وصول ہوں گے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ احتمال کے درجے میں بلاشبہ یہ دونوں باتیں درست ہوسکتی ہیں؛ لیکن معاملہ کی رائج شکل اور اس حوالہ سے جانبین کے تعامل وتفاہم کو دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں احتمال بعید ہیں اور ان کی بجائے اس کے شرط فاسد ہونے کا احتمال زیادہ راجح ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جانبین میں صاف طور پر یہ بات طے کی جاتی ہے کہ فی ماہ تنخواہ اس قدر ہوگی، مہینہ کے آخر میں ملنے والی رقم بھی خاص اس مہینہ کی اجرت سمجھی جاتی ہے، جانبین کا یہ واضح تعامل وتفاہم غیر واضح احتمال کی بنسبت بہر حال راجح اور مقدم ہے۔

سال کے آخر میں مدرس کو برطرف کر دینا کیسا ہے؟

مدرس سال بھر تدریس کرتا رہا، سال کے آخر میں مدرسہ نے اس کو رخصت کر دیا، مدرس کو رخصت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کا طریقہ کیا ہے؟ ان دونوں باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اصل بات کا جواب یہ ہے کہ اگر مدرس ادارہ کے اس فیصلے کو قبول کر لے تو اس کے بعد عقد ختم ہو جائے گا اور جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے کہ عقد ختم ہو جانے کے بعد اجرت کے استحقاق کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی؛ اگر مدرس ادارے کے اس فیصلے کو قبول نہیں کرتا اور اس حال میں شعبان یا رمضان کا مہینہ بھی ختم ہو جائے اور وہ تنخواہ کا مطالبہ کرے تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا مدار عقد کی مدت ختم ہونے نہ ہونے پر ہے، لہٰذا:

ا:۔ اگر تقرری کے وقت رمضان یا شعبان کے آخر تک مدرسہ کے ساتھ ملازم/ مدرس کے طور پر رہنے کی بات ہوئی تھی اور اب رجب کے آخر میں اس کو رخصت کیا گیا، تو اس کا حکم یہ ہے کہ:

الف :اگر مدرس کی کسی واقعی کوتاہی کی وجہ سے ایسا فیصلہ کیا گیا اور کوتاہی بھی ایسی تھی

جس کے ساتھ عقد برقرار رکھنا ادارے کے لئے کسی ایسے بوجھ ونقصان کا موجب ہو جو طے شدہ شرائط وضوابط کے خلاف ہو تو اس صورت میں رخصت کرنا بھی درست ہے اور مزید ایام کی اجرت کا استحقاق بھی نہیں ہے۔

ب :اگر مدرس کی طرف سے طے شدہ ضوابط کی خلاف ورزی نہیں ہوئی تو اس صورت میں اس دوران عقد ختم کرنا درست ہے اور نہ ہی بقیہ ایام کی تنخواہ کا استحقاق ختم ہوگا۔

اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جو پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ اجارہ عقد لازم ہے اور کوئی فریق دوسرے کی رضامندی کے بغیر اس کو ختم کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، اور یہ کہ کوئی معتد بہ عذر یا عیب پیدا ہو جائے۔

۲۔اگر تقرری کے وقت تعلیمی سال کی بات طے ہوئی تھی کہ رجب کے آخر تک وہ ادارے کا مدرس/ملازم رہے گا تو اس صورت میں رجب کے آخر میں ہر فریق کو اختیار ہے کہ معاہدہ برقرار رکھے یا ختم کرے، ختم کرنے کی صورت میں مزید اجرت کا استحقاق نہیں رہے گا۔

اگر استاذ کی تقرری شعبان میں ہو تو تنخواہ کب سے ملے گی؟

نیا عقد طے ہو جائے شعبان یا رمضان میں نئے مدرس کے ساتھ ادارے کی بات طے ہو جائے اور آئندہ سال کے لئے ادارہ میں اس کی تقرری ہو جائے۔اس کا حکم یہ ہے کہ عقد شروع ہونے کے وقت سے اجرت کا استحقاق بھی شروع ہو جاتا ہے، رہا یہ سوال کہ عقد اجارہ کس وقت سے شروع سمجھا جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اجارہ کا ضابطہ یہی ہے کہ اگر عقد میں کسی خاص تاریخ سے اجارہ شروع ہونا طے ہو جائے تو اس کا اعتبار ہوگا، ورنہ تو خود ایجاب و قبول کے وقت سے ہی عقد شروع ہو جائے گا۔

”إِنْ لَمْ يَذْكُرْ ابْتِدَاءَ الْمُدَّةِ حِينَ الْعَقْدِ تُعْتَبَرُ مِنْ وَقْتِ الْعَقْدِ.

أَيْ أَنَّهُ يُعْتَبَرُ ابْتِدَاءُ مُدَّةِ الْإِجَارَةِ مِنْ وَقْتِ الْعَقْدِ إذَا لَمْ يُذْكَرْ عِنْدَ عَقْدِ الْإِجَارَةِ وَلَمْ يُعَيَّنْ. وَتَكُونُ الْإِجَارَةُ مُنَجَّزَةً; لِأَنَّهُ لَمَّا كَانَتْ الْأَزْمَانُ كُلُّهَا فِي حُكْمِ هَذِهِ الْإِجَارَةِ مُتَسَاوِيَةً اُعْتُبِرَ فِي أَمْثَالِ ذَلِكَ الزَّمَنُ الَّذِي يَعْقُبُ الْعَقْدَ"(۱)

مدت اجارہ کی ابتداء کا اس وقت سے اعتبار کیا جائے گا جس وقت سے شروع ہونا طے ہو، یعنی معاملہ کے وقت اس کا تذکرہ کی جائے۔اگر عقد کرتے وقت اجارہ کی ابتدائی وقت کے بارے میں کچھ طے نہ ہوا ہو تو عقد کے وقت سے ابتداء سمجھی جائے گی...الخ۔

کیا منتظم اجارۂ مضافہ کا پابند ہے؟

اس پر یہ اشکال کیا جا سکتا ہے کہ ادارے کا متولی تو مصلحت کے لحاظ رکھنے کا پابند ہے، اب جب معلوم ہے کہ تدریس کا عمل شوال کے درمیان یا آخر سے شروع ہو گا تو شعبان و رمضان میں وہ کیونکر کسی کی تقرری کر سکتا ہے؟ کیونکر وہ اس ایک یا دو مہینوں کی اجرت کا بوجھ ادارے پر ڈال سکتا ہے! ہونا تو یہ چاہیئے کہ ایام عمل سے پہلے اس کو تقرری کرنے کا اختیار ہی نہ دیا جائے، اگر تقرری کرنا ہی ہے تو ''اجارۂ مضافہ'' کا معاملہ کیا جائے!

اس کا جواب یہ ہے کہ اجارہ مضافہ راجح قول کے مطابق لازم نہیں ہوتا؛ بلکہ متعلقہ وقت کے آنے سے پہلے فریقین کو عقد ختم کرنے کا اختیار ہوتا ہے جبکہ ادارے کی مصلحت اس میں ہے کہ عقد لازم کیا جائے، نیز ان دنوں اجرت نہ دینے کی صورت میں مدرس کوئی کاروبار، ملازمت وغیرہ اختیار کرے گا جس سے اس کی صلاحیت، یکسوئی اور علمی مزاج و مذاق وغیرہ صلاحیتوں اور عادات وافکار میں خلل آئے گا اور یہ خلل خود

(۱) درر الحکام شرح مجلۃ الأحکام: ۱/۴۷۵

ادارے کے لئے مضر ثابت ہوسکتا ہے، اس لئے خود ادارے کی مصلحت بھی اسی میں معلوم ہوتی ہے کہ ان ایام کی اجرت دے دی جائے۔

یہ ساری تفصیل تو اس وقت ہے کہ جب شعبان ورمضان میں صرف تدریس کا عقد طے ہوجائے اور عملی طور پر تدریس شوال میں شروع کرے، اگر عقد طے کرنے کے بعد ہی تدریس شروع کی جائے جیسا کہ ہمارے ہاں متعدد مدارس میں مختلف علوم وفنون کے دورے منعقد ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں بلاشبہ اجرت کا استحقاق بھی شروع ہو جاتا ہے، بلکہ جیسا کہ ہمارے ہاں عام دینی مدارس میں رواج ہے کہ تعطیلات کے ایام میں تدریس وغیرہ خدمات انجام دینے پر دُگنا مشاہرہ ملتا ہے اس میں مضائقہ نہیں، اور جہاں اس کا عام تعامل ہو یا صاف طور پر طے ہوجائے وہاں اس کے مطابق دگنا مشاہرہ ملے گا۔(۱)

کورونا کی وجہ سے کسی استاذ کو برطرف کردینا

کورونا کی وجہ سے جو صورتِ حال ہے، اس میں اگر اساتذہ نے خدمت نہیں کی تو وہ تنخواہ کے مستحق ہوں گے یا نہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے، اور یہ اس لئے اہم ہے کہ اس صورت حال کے پیدا ہونے میں قصور نہ انتظامیہ کا ہے اور نہ اساتذہ کا؛ بلکہ ایک خاص قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں، ان حالات کی وجہ سے ایسی نوبت آتی ہے کہ ہر کسی کی تنخواہ ادا کرنی مشکل ہوجاتی ہے۔

مسئلہ کے فقہی پہلو پر غور کیجئے، فقہی اصطلاح میں آجر اور اجیر یا مالک اور ملازم کا معاملہ اجارہ کہلاتا ہے؛ لہٰذا یہاں دو باتیں قابل غور ہیں، اول یہ کہ کیا ان حالات کی وجہ سے ادارہ کی مجلس انتظامی کو حق ہے کہ وہ کسی استاذ یا کارکن کو سبکدوش کردے؟ تو اس کا انحصار اس

(۱) علمی وفقہی مقالات: ۴/۴۱ تا ۴۷

بات پر ہے کہ اجارہ ''عقود لازمہ'' میں سے ہے یا نہیں ہے؟ یعنی کسی کو اجرت پر رکھنا کیا ایسے معاملات میں ہے، جس کو ایک فریق ختم نہیں کر سکتا یا ایسا نہیں ہے؟ اگر اجارہ عقد لازم (لازمی معاملہ) ہے تو کسی ایک فریق کے لئے دوسرے کی رضامندی کے بغیر اجارہ کو ختم کرنا درست نہیں ہوگا، اور اگر اجارہ عقد لازم نہیں ہے، تو ایسی صورت میں کسی بھی ایک فریق کو عذر کی وجہ سے اس کو ختم کرنے کا حق ہوگا۔

اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے، حنفیہ کے نزدیک دونوں میں سے کوئی ایک فریق یعنی آجر یا ملازم کسی عذر کی بنا پر اجارہ کو ختم کرنا چاہے تو کر سکتا ہے؛ چنانچہ مشہور فقہی انسائیکلو پیڈیا ''الموسوعہ الفقہیہ'' میں احناف کی معتبر کتابوں ''بدائع الصنائع، فتاویٰ عالمگیری اور المبسوط'' کے حوالہ سے لکھا ہے: حنفیہ کی رائے ہے کہ دونوں فریقوں میں سے کسی کو عذر پیش آجائے، یا جس چیز کو اجرت پر حاصل کیا گیا، اس کی نسبت سے عذر پیدا ہو جائے تو اجارہ کو ختم کر دینا جائز ہے، یہ معاملہ لازم نہیں ہوگا اور اس کو فسخ کرنا درست ہوگا؛ کیوں کہ عذر پیش آنے کی صورت میں یہ ایک ضرورت ہے۔

''الحنفية كما سبق، يرون جواز فسخ الاجارة لحدوث عذر بأحد العاقدين، أو بالمستأجر (بفتح الجيم)، ولا يبقى العقد لازما ويصح الفسخ اذ الحاجة تدعو اليه عند العذر الخ''(۱)

فقہ حنفی کی مشہور کتاب تاتارخانیہ میں ہے: ہمارے نزدیک اجارہ کے معاملہ کو عذر پیش آنے کے وقت ختم کیا جا سکتا ہے، چاہے یہ دونوں فریقوں میں سے ایک کی طرف سے ہو یا جس چیز کو کرایہ پر حاصل کیا جا رہا تھا، اس کی وجہ سے ہو.................اور ''تجرید'' (کتاب کا نام) میں ہے کہ عذر یہ ہے کہ نفع اٹھانے سے رکاوٹ پیدا کرنے والی کوئی چیز پیدا ہو جائے، یا اس کا نفع کم ہو جائے۔

---

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ ۱: ۱۷۲/۱

”قال :الاجارة تنفسخ بالأعذار عندنا، وفي الظهيرية :
وذلک اما أن يكون من قبل أحد العاقدين أو من قبل المعقود
عليه....... وفي التجريد: العذر أن يحدث في العين ما
يمتنع الانتفاع به أو تنتقض المنفعة“(١)

موجودہ صورت حال میں تعلیم کا موقوف ہو جانا ایک عذر ہے؛ کیوں کہ مدرسہ اپنے ملازمین سے متعین نفع اٹھانے سے قاصر ہے اور وہ اسی مقصد کے لئے ملازمین کا تقرر کرتا ہے، مالکیہ کی رائے بھی قریب قریب وہی ہے جو احناف کی ہے؛ البتہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اجارہ عقد لازم ہے اور کوئی ایک فریق اسے یکطرفہ طور پر ختم نہیں کرسکتا ہے۔(٢)

مدارس کی خدمت اجارۂ لازمہ میں سے نہیں ہے

غور کیا جائے تو ہندوستان میں مدارس کا عرف بھی وہی ہے، جو احناف کا نقطۂ نظر ہے، اس کا ایک فریق جو ملازم ہے، وہ جب چاہے اپنے طور پر مدرسہ چھوڑ دیتا ہے اور انتظامیہ بھی یک طرفہ طور پر کسی ملازم کی برطرفی کا فیصلہ کرتی ہے، اور جو حکم اجارہ کو ختم کرنے کا ایک فریق کے لئے ہے، وہی دوسرے فریق کیلئے بھی ہے، تو جب اساتذہ یا ملازمین یکطرفہ طور پر مدرسہ کی خدمت کو چھوڑ دیتے ہیں؛ بلکہ بہت سی دفعہ کسی مصلحت یا منفعت کی بنیاد پر درمیانِ سال میں بھی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، جس سے طلبہ کی تعلیم کا بہت نقصان ہوتا ہے اور ادارہ کی ساکھ بھی خراب ہوتی ہے، تو صرف دوسرے فریق کو کیسے اس کا پابند کیا جا سکتا ہے؟ ہاں اگر مدرسہ کے دستور میں پہلے سے ہو، یا ملازم سے معاہدہ ہوا ہو کہ اسے ہٹایا نہیں جائے گا، تب اس شرط کا پاس رکھنا واجب ہوگا۔

نیز ہمارے ملک میں جب سرمایہ دارانہ نظام کو مضبوطی حاصل ہوئی تو حکومت سے

---

(١) تاتارخانیہ، کتاب الاجارۃ ۱۵ : ۱۵۹/
(٢) الموسوعۃ الفقہیہ ۱: ۲۷۱/

مطالبہ کیا گیا کہ لیبر لا میں سرمایہ کاروں کے حقوق بڑھائے جائیں، اور ان کو بہت زیادہ پابند نہ کیا جائے؛ چنانچہ ابھی ہمارے ملک میں پرائیوٹ اداروں کے لئے بھی ایسا لزوم نہیں ہوتا کہ وہ کسی ملازم کو ہٹا نہیں سکیں؛ اسی لئے آئے دن کمرشیل ادارے، کمپنیاں اور عصری تعلیمی ادارے حسب ضرورت اپنے ملازمین کو سبکدوش کرتے رہتے ہیں، ہاں! گورنمنٹ ملازمین کا معاملہ الگ ہے؛ کیوں کہ گورنمنٹ کا اپنا قانون ہے کہ وہ کسی ملازم کو سبکدوش نہیں کرے گی، تو بہت خصوصی حالات کے سوا اُن کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا، اس لئے یہ کہنا کہ عرف ایسا ہے کہ کوئی استاذ یا کوئی ملازم رکھا جائے تو اس کو یکطرفہ سبکدوش نہ کیا جائے، یہ کچھ خاص اداروں کے پس منظر میں تو ہوسکتا ہے، جن کے یہاں پہلے سے اس طرح کا ضابطہ بنا ہوا ہو؛ لیکن عمومی طور پر ایسا نہیں ہے؛ البتہ یہ بات فقہی جہت سے ہے، آگے اخلاقی تقاضوں، مدارس کی روایات اور دینی خدمت گزاروں کی اہمیت کے اعتبار سے تجویز پیش کی جائے گی؛ تاکہ مسئلہ کا حل نکل سکے۔

کورونا کی وجہ سے اساتذہ کا تنخواہ کا مستحق ہونا یا نہ ہونا

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کورونا کی وجہ سے اگر اساتذہ نے خدمت نہیں کی تو وہ تنخواہ کے مستحق ہوں گے یا نہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے، اور یہ اس لئے اہم ہے کہ اس صورت حال کے پیدا ہونے میں قصور نہ انتظامیہ کا ہے اور نہ اساتذہ کا؛ بلکہ ایک خاص قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں، ان حالات کی وجہ سے یہ نوبت آرہی ہے، اگر ہم فقہی کتابوں کی طرف رجوع کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر اجیر نے اپنا کام اس لئے نہ کیا ہو کہ جس نے اسے اجرت پر رکھا ہے، اس کی طرف سے رکاوٹ ہو، مثلاً: مدرس مدرسہ میں موجود ہو؛ لیکن انتظامیہ نے اسے پڑھانے سے روک دیا ہو تو اس صورت میں وہ تنخواہ کا مستحق ہوگا، اسکی اجرت دینی شرعاً واجب ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ خدمت نہ کرنے میں ملازم (اجیر) کا قصور ہو، وہ خود مدرسہ نہیں آیا، غیر حاضر رہا، مدرسہ کے قانون کے اعتبار سے رخصتوں کی جو حدیں مقرر ہیں،

اس سے زیادہ دنوں غیر حاضر ہوگیا تو اس شکل میں وہ اجرت کا مستحق نہیں ہوگا، تیسری صورت یہ ہے کہ ملازم کے خدمت سے قاصر رہنے میں نہ اس کا قصور ہے اور نہ انتظامیہ کا؛ بلکہ قدرتی آفات کے تحت وہ خدمت کرنے سے قاصر ہوگیا ہو تو فقہاء کی عبارت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں اس کی اجرت واجب نہیں ہوگی؛ چنانچہ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: ''اجیر (ملازم) اگر کام نہ کرے مگر اس نے اپنے آپ کو حوالہ کر دیا ہو اور کام کرنا اس کے لئے ممکن تھا، تو وہ اجرت کا حقدار ہوگا، یہاں تک کہ اگر اس نے اپنے آپ کو حوالہ کر دیا؛ حالاں کہ کسی رکاوٹ کی وجہ سے وہ اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا، تو اجرت واجب نہیں ہوگی؛ چنانچہ ''ذخیرہ'' (ایک کتاب کا نام) میں ہے: اگر صحرا میں مٹی بنانے یا کسی اور کام کے لئے اجیر رکھا، پھر اس دن اجیر کے صحراء میں چلے جانے کے بعد بارش ہوگئی تو اس کی اجرت واجب نہیں ہوگی، صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانیؒ بھی اس پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔

''انه انما يستحق الأجرة بتسليم نفسه بدون العمل اذا تمكن من العمل، حتى لو سلم نفسه و لم يتمكن من العمل لعذر منعه لم يجب الأجر، فانه ذكر في ''الذخيرة'' لو استأجره لاتخاذ الطين أو غيره في الصحراء فمطر ذلك اليوم بعد ما خرج الأجير الى الصحراء لا أجر له، وبه كان يفتي المرغيناني''(۱)

محیطِ برہانی اور جوہرہ کی تمثیلات

محیط برہانی اور تاتارخانیہ میں ہے: جب اجارہ کا معاملہ ایک مدت یا ایک مسافت کے لئے طئے ہو تو اس مدت یا مسافت تک اجارہ باقی رہے گا، اگر اس مقررہ مدت یا طئے شدہ مسافت کے درمیان ایسی بات پیش آگئی جو مطلوبہ فائدہ اٹھانے میں رکاوٹ ہے، تو اتنی

(۱) البنایہ شرح الہدایہ ۱۰: ۳۱۹، نیز دیکھئے: شلبی علی تبیین الحقائق، باب ضمان الاجیر ۵: ۱۳۷، مجمع الانہر، ۲/ ۳۹۳، ردالمحتار ۶: ۶۹/

مدت کی یا مسافت کی اجرت واجب نہیں ہوگی، جیسے : (جانور پر اجارہ ہوا اور) کسی لٹیرے نے اس کو غصب کرلیا، یا (کسی غلام کو اجرت پر حاصل کیا اور) وہ بیمار پڑ گیا، یا بھاگ گیا، یا (زمین اجرت پر لی اور) وہ پانی میں ڈوب گئی، یا اس کو سیراب کرنے والی نہر خشک ہوگئی۔

"اذا وقع عقد الاجارة صحيحا على مدة أو مسافة، وجب تسليم ما وقع عليه العقد دائما مدة الاجارة فان عرض في بعض المدة، أو المسافة ما يمنع الانتفاع سقط الأجر بقدر مدة المنع، وذلک بأن يغصبه غاصب أو يحدث فيه مرض، أو اباق، أو يغرق الأرض، أو ينقطع عنها الشرب" (۱)

صاحب جوہرہ کے یہاں ایک اور مثال ملتی ہے کہ کسی نے بکری چرانے پر کسی شخص کو رکھا تو اگر نصف یا نصف سے زیادہ بکریاں بھی مر گئی ہوں، تب بھی اسکو پوری اجرت ملے گی، اور فقہاء کے یہاں برعکس مفہوم کا اعتبار ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمام بکریاں مر گئیں تو پھر اجیر اجرت کا مستحق نہیں ہوگا، یہ اور بات ہے کہ علامہ شامیؒ نے اس سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں برعکس مفہوم کا اعتبار نہیں ہے (۲)

لیکن یہ بات "جوہرہ" کی عبارت سے ثابت نہیں ہے، اور فقہاء کے یہاں اصول یہی ہے کہ فقہاء کے کلام میں برعکس مفہوم (مفہوم مخالف) معتبر ہوتا ہے، خلافت عثمانی میں مرتب ہونے والے مجموعہ قوانین (مجلة الاحکام) کی شرح درر الاحکام میں ایک اصولی بات کہی گئی ہے کہ : کام کے لئے حاضر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کام کے لئے پیش کرے، وہ اس کام پر قادر بھی ہو اور اس وقت اس کے لئے اس کام کو انجام دینا ممکن بھی ہو :

"ومعنیٰ کونه حاضرا" الخ (۳)

---

(۱) تاتارخانیہ ۱۵ : ر۹۴، نیز دیکھئے : محیط برہانی ۷ : ر۴۶

(۲) رد المحتار ۹ : ر۹۶

(۳) درر الاحکام شرح مجلة الاحکام ۱ : ر۴۵۸، دفعہ : ۴۲۵

اور اس نقطۂ نظر پر انھوں نے روشنی حاصل کی ہے مشہور حنفی فقیہ علامہ زیلعیؒ سے، جو کہتے ہیں کہ اگر آجر ملازم سے کام نہ لے سکے اور کوئی حسی رکاوٹ جیسے : بیماری یا بارش نہیں پائی گئی ہو تب کام نہ کرنے کے باوجود بھی وہ اجرت کا مستحق ہوگا۔(۱)

کورونا سلطانی آفت و آسمانی عذر ہے

لہٰذا اگر کوئی قدرتی رکاوٹ موجود ہو تو وہ اجرت کا حقدار نہیں ہے، جیسے بارش کا ہونا، سیلاب میں زمین کا ڈوب جانا، سیراب کرنے والی نہروں کا خشک ہونا یا بیمار پڑ جانا ایک قدرتی آفت ہے، اسی طرح کورونا ایک قدرتی آفت ہے اور اس کی وجہ سے سرکار کی طرف سے لاک ڈاؤن ایک سلطانی آفت ہے تو یہ ایک آسمانی سلطانی عذر ہے، اس میں فقہاء کے بیان کئے ہوئے اس اصول کے اعتبار سے مدارس کی انتظامیہ پر تنخواہ دینا لازم نہیں ہے، اگر ہم مدارس کے حالات کا لحاظ کئے بغیر بہر صورت مکمل تنخواہ لازم قرار دیں تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے مدرسے بند ہو جائیں گے، یا انتظامیہ مجبور ہو کر اساتذہ کو سبکدوش کر دے گی، بعض جگہ اساتذہ کا عملہ اتنا بڑا ہے کہ موجودہ حالات میں ان کی تنخواہ دینا مدرسہ کے لئے ممکن نہیں ہے، اسی طرح بہت سے مدرسے دیہاتوں میں، قصبات میں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں بہت مشکل اور دشواری کے حالات میں چلتے ہیں، اکثر شعبان میں ان پر کافی قرض ہو جاتا ہے، اور وہ رمضان کی وصولی سے اس قرض کو ادا کرتے ہیں، تو پھر شوال سے مدرسہ چلتا ہے تو اگر ہم ایسا بوجھ مدرسہ پر ڈالیں اور ان کو اس کا پابند کریں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے مدارس کو اپنی خدمت بند کر دینی ہوگی، اور اس کا جو نقصان ہوگا، وہ ظاہر ہے۔

کیا مدارس کے پاس دو دو سال کا بجٹ ہوتا ہے؟

یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ تمام اداروں کے پاس سال سال بھر کا بجٹ موجود ہوتا ہے،

(۱) درر الاحکام شرح مجلۃ الاحکام ۱ : ۴۵۸/، دفعہ: ۴۲۵

پورے ہندوستان میں انگلیوں پر گنے جانے والے شاید دو چار مدرسے ایسے ہو سکتے ہیں، جن کے پاس آئندہ سال کا بجٹ موجود رہتا ہو، بعض علاقوں میں ایسے مدارس ہیں کہ جنھوں نے مستقل آمدنی کے ذرائع اپنے لئے مہیا کر لئے ہیں، جیسے عمارتیں بنادی گئیں، یا خریدی گئیں، اور وہ مدرسہ کے لئے وقف ہیں، ان کو کرایہ کی ایک خطیر رقم آجاتی ہے، یا کوئی صاحبِ ثروت خاندان بیرونی ملکوں میں رہتا ہے، جس کا بڑا بزنس ہے اور اس نے مدرسہ کا پورا خرچ اپنے ذمہ لے رکھا ہے، تو یہ استثنائی صورتیں ہیں اور ایسے اداروں کو ضرور استحساناً پوری تنخواہ ادا کرنی چاہیئے؛ مگر مدارس کی ۹۰ رفیصد سے زیادہ تعداد وہ ہے، جن کے پاس ایسے وسائل نہیں ہیں، اگر ان سب پر پوری تنخواہ کی ادائیگی کو لازم کر دیا جائے تو اس سے ادارے بند ہو جائیں گے اور بحیثیت مجموعی اس کا خسارہ تمام مسلمانوں کو اٹھانا ہوگا۔

کورونا میں اساتذہ کے ساتھ اخلاقی پہلو

یہ تو اس مسئلہ کا فقہی پہلو ہے؛ البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ ہمارے فقہاء نے معاملات کے جو احکام لکھے ہیں، وہ اصل میں عدالتوں کے لئے ہیں، کہ جب کسی مسئلہ میں دو فریق کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے، تو قاضی اس میں کس طرح فیصلہ کرے؟ گویا اصطلاحی طور پر یہ قولِ قضا ہیں، قولِ دیانت نہیں ہیں، اور مدارس قانونی ضابطوں سے نہیں چلتے؛ بلکہ باہمی رابطوں سے چلتے ہیں؛ اس لئے ہمیں اخلاقی بنیادوں پر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

رسول اللہ ﷺ نے بعض دفعہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اصل حکم شرعی سے ہٹ کر ایک جائز درمیانی صورت نکالی اور معاملہ کے دونوں فریقوں کو اس پر عمل کرنے کا حکم فرمایا، سیدنا حضرت عبداللہ ابن کعب ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیسے حضرت ابی حدود رضؓ کے یہاں باقی تھے، رسول اللہ ﷺ اپنے حجرہ مبارک میں تشریف فرما تھے، مسجد میں دونوں کے درمیان کچھ کہا سنی ہوئی اور آواز اونچی ہوگئی، آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے

اورحضرت عبداللہ ابن کعبؓ سے فرمایا کہ تم آدھا دَین معاف کردو اور ابن ابی حدردؓ سے فرمایا کہ تم نصف دین ابھی ادا کردو۔(۱)

غور فرمائیے کہ فتویٰ کی بات تو یہ تھی کہ حضرت ابن ابی حدودؓ سے کہا جاتا کہ تم پورا دَین ادا کرو؛ کیوں کہ جو دَین کسی کے ذمہ باقی ہو، وہ اس پر پورا کا پورا ادا کرنا واجب ہے، یا عبداللہ ابن کعب سے کہا جاتا کہ تمہارا مقروض ابھی دَین ادا کرنے کے موقف میں نہیں ہے، ایسی صورت میں تم پر واجب ہے کہ ان کو مہلت دو؛ لیکن حضور ﷺ نے نہ عبداللہ ابن کعبؓ پر پورا دَین ادا کرنے پر اصرار کیا اور نہ ابن ابی حدود کے لئے یہ سفارش فرمائی کہ ان کو مہلت دی جائے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خان کا واقعہ

مسیح الملک حکیم اجمل خان (م ۲۸/ ڈسمبر ۱۹۲۷ء) امیر جامعہ اسلامیہ، دہلی، ۱۹۲۹ء میں جامعہ اسلامیہ کے اساتذہ کو آٹھ ماہ تک تنخواہ نہ مل سکی، حکیم اجمل خان نے قاضی عبدالغفار صاحب کو بلا کر ایک ہیرے کی انگوٹھی دی اور کہا کہ اسے بمبئی لے جا کر فروخت کردو، بیس ہزار روپئے کی قیمت ملی، تنخواہ تقسیم کرنے کے بعد باقی رقم محفوظ میں جمع کردی گئی۔ پھر کہنے لگے کہ: جامعہ تو چلانا ہوگا، آپ کو روپیہ کی دقت ہے تو میں بھیک مانگ لوں گا۔(۲)

مشکل حالات میں مدرسین کو بھول جانا غیر اخلاقی امر ہے

(۱) امام ومؤذن ہوں یا اساتذہ، ان کو الگ کردیا جانا نامناسب اور غیر اخلاقی فعل ہے، جو مدرس کم تنخواہ پر ادارہ کی خدمت کرتا آیا ہے، مشکل حالات میں اس کو چھوڑ دینا اور اس

(۱) بخاری، حدیث: ۴۵۷

(۲) ہماری زبان۔ ستمبر ۱۹۸۵ء بحوالہ: سب کے لئے، ابن غوری: ۶۵

کی کوتاہی کے بغیر اس کو علاحدہ کر دینا کسی طرح مناسب نہیں، اگر دینی اداروں کو ضابطہ اور قانون کی بنیاد پر چلایا جائے تو ان کا چلانا مشکل ہو جائے گا، لیبر لا کے تحت ایک اجیر کی یومیہ کم سے کم اجرت مقرر ہے، کم مدرسے اور مسجدیں ہیں جن میں دینی خدمت گزاروں کی تنخواہ اس معیار کو پورا کرتی ہے، اگر وہ کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹائیں تو ہر مدرسہ میں ایک فتنہ پیدا ہو جائے؛ لیکن اساتذہ دینی جذبہ کے تحت اللہ کی رضا کے لئے کم سے کم تنخواہوں میں خدمت کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح لیبر لا کے تحت مزدوروں کے اوقات کار مقرر ہیں، آپ کسی مزدور سے آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لے سکتے؛ لیکن مدارس میں جو اساتذہ دارالاقاموں میں رہتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ وہ ۲۴ر گھنٹے مصروف رہتے ہیں، تو بے جا نہ ہوگا، وہ صبح میں بھی پڑھاتے ہیں، ظہر کے بعد بھی، اور جہاں اونچی کتابیں ہیں، وہاں مغرب بعد بھی اور بعض اوقات عشاء کے بعد بھی، یہاں تک کہ عصر بعد بھی طلبہ کی نگرانی کرتے ہیں، اگر وہ کہیں کہ قانون کے اعتبار سے جتنا کام لیا جا سکتا ہے، ہم اس سے زیادہ کام نہیں کریں گے تو کتنی دشواری پیدا ہو جائے گی؟ اس لئے ہمارا موقف ہونا چاہئے کہ ہم کسی بھی دینی خدمت گزار کو کی کوتاہی کے بغیر صرف اس صورت حال کی وجہ سے مدرسہ سے علاحدہ نہیں کریں گے۔

مکمل تنخواہ نقد ہو تو؛ پابندی کے دنوں میں اساتذہ سے لینے کے کام

(۲) جو ادارے اس موقف میں ہوں کہ اپنے ملازمین کو نقد تنخواہ دے سکتے ہوں، تو ان کو نقد تنخواہ دینی چاہئے، اور اگر تعلیم کے علاوہ مدرسہ کا اور کوئی کام استاذ کر سکتا ہو، جیسے: لائبریری کی تنظیم و تنسیق، یا اس طرح کے دوسرے کام تو یہ ان سے لیا جائے، یا ان سے کہا جائے کہ آپ کو سال بھر جو پڑھانا ہے، آپ اس کی یادداشت تیار کر کے مدرسہ کو پیش کیجئے، ان کو زیر درس کتابوں کے خصوصی مطالعہ کا پابند کیا جائے، مثلاً ایک استاذ ہدایہ پڑھاتا ہے تو اس سے کہا جائے کہ آپ اس لاک ڈاؤن کے زمانہ میں پوری فتح القدیر دیکھ جائیے اور اس کی

تلخیص تیار کیجئے؛ تاکہ جب آئندہ طلبہ پڑھیں تو ان کو زیادہ فائدہ ہو، وغیرہ وغیرہ۔

ایک سوال یہ بھی اُٹھایا گیا ہے کہ جب تک معاونین کی اجازت نہ ہو، کیا بغیر کام کے ان کو اجرت دی جاسکتی ہے؟ تو خیال ہوتا ہے کہ اجازت کبھی صراحۃً ہوتی ہے اور کبھی دلالۃً اور معناً، آج کے ماحول میں اگر چندہ دینے والوں کو معلوم ہو کہ فلاں مدرسہ اپنے اساتذہ کو تنخواہ دے رہا ہے تو یہ ایسی بات نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے وہ ناراض ہوں؛ بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس پر خوشی کا اظہار کریں کہ اس مصیبت کے وقت میں ہمیں مدد کرنی چاہئے تھی، ہم نہیں کر سکے اور مدرسہ ہمارا فرض ادا کر رہا ہے، ان شاء اللہ یہ دلالۃً اجازت کافی ہوگی۔

مکمل تنخواہ بعد میں دینے کی امید ہو تو؟

(۳) اگر پوری تنخواہ نقد ادا کرنے کی گنجائش نہیں ہو؛ البتہ امید ہو کہ بعد میں ادا کرنے کی گنجائش پیدا ہو جائے گی تو انتظامیہ تنخواہ کا ایک حصہ نقد ادا کر دے اور کوشش کرے کہ یہ نصف سے کم نہ ہو، اور اساتذہ سے کہہ دیا جائے کہ مدرسہ کے پاس جب ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی، تب ادا کر دے گا، یعنی ادا ضرور کرے گا؛ لیکن اپنی سہولت کے لحاظ سے؛ کیوں کہ جو صورت حال ہے، ضروری نہیں ہے کہ مدارس مستقبل قریب میں اس موقف میں آجائیں کہ پچھلے بقایا کو ادا کرسکیں، صورت حال درست تو ہوگی، معمول کی آمد و رفت شروع ہوگی، پھر جو لوگ مدرسہ کے لئے فراہمی مالیہ کا کام کرتے ہیں، وہ معاونین کے پاس پہنچیں گے، اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ معاونین کا بھی کچھ کاروبار چلے؛ تاکہ وہ تعاون کرنے کے موقف میں آجائیں، تب مدارس کے مالی حالات بہتر ہوں گے، اور اگر مقروض دیوالیہ ہو جائے تو شرعاً بھی اس کو مہلت دینا واجب ہے۔

مشکل حالات میں نصف تنخواہ کا نظام

(۴) اگر مدرسہ کے پاس نہ اس وقت پیسہ ہے اور نہ یہ امکان ہے کہ مستقبل قریب میں

اس کے پاس اتنے پیسے ہو جائیں گے کہ وہ اساتذہ کی پچھلے دنوں کی تنخواہ ادا کر سکے، تو پھر اس صورت میں پوری تنخواہ کے بجائے اس مدت کی نصف تنخواہ دی جائے، کچھ مشقت مدرسہ برداشت کرے اور کچھ اساتذہ، اس طرح دین کا یہ اہم کام جاری وساری رہے، اور اس کی نظیر حضرت عبداللہ بن کعب بن مالکؓ اور حضرت ابوحدودؓ کا واقعہ ہے، جو پہلے ذکر کیا گیا۔

مشکل حالات میں اصحابِ خیر کا متوجہ ہونا

(۵) اِن حالات میں ایک اہم ذمہ داری عوام کی ہے کہ اگر چہ بہت سے اصحاب خیر موجودہ حالات سے متأثر ہوئے ہیں؛ لیکن ظاہر ہے کہ ان ہی حالات میں ہم اپنے گھروں کی تمام ضروریات پوری کرتے ہیں، اور اسی طرح پوری کرتے ہیں، جس طرح پہلے پوری کر رہے تھے؛ بلکہ اس وقت لاک ڈاؤن کے درمیان مسلمانوں نے جس فراخدلی کے ساتھ تارکِ وطن مزدوروں کی اور سماج کے غریب لوگوں کی بلاتفریق مذہب وملت مدد کی ہے، وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، اور یہ بہت ہی اچھی بات ہے، جتنی نفرت مسلمانوں کے خلاف پیدا کی جارہی تھی، اس خدمت نے نفرت کے ان شعلوں کی آنچ کو کم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے، تو جیسے ان حضرات نے ان موقعوں پر مدد کا ہاتھ بڑھایا، اسی طرح اب مدارس اور ان کے اساتذہ وعملہ کی طرف بھی مدد کا ہاتھ بڑھائیں؛ کیوں کہ یہ آپ کے سپاہی ہیں، یہ آپ کی دینی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں اور کتنے بھی مشکل حالات ہوں، آپ جانتے ہیں کہ کوئی ملک اپنے دفاع کو خطرے میں نہیں پڑنے دیتا ہے۔

مسئلہ کا حل فتوی نہیں ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ فتوؤں سے حل ہونے والا نہیں ہے، اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مرکزی اداروں کے ذمہ داران اور ملت کی اہم تنظیمیں ایک قابل عمل فارمولہ تیار کریں، مدارس کی انتظامیہ اور اساتذہ دونوں کے سامنے رکھ دیں اور دونوں سے اس پر

عمل کرنے کی اپیل کریں؛ کیوں کہ یہ ہنگامی حالات ہیں، اور غیر معمولی حالات کے احکام بھی غیر معمولی ہوتے ہیں، اس میں اساتذہ کی بھی رعایت ہونی چاہئے اور مدارس پر بھی اتنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے، جو قابل برداشت نہ ہو، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر قیمت پر مدارس اسلامیہ کو باقی رکھنا ملت اسلامیہ اور اصحاب خیر کا فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ سبھوں کو اس صورت حال کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے''۔(۱)

ضروری تنبیہ

یہاں تک اس مسئلہ کی کچھ ضروری تفصیلات ذکر کی گئیں ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ دینی مدارس کا اصل مقام یہ ہے کہ دینی احکام وتعلیمات پر عمل کرنے اور دینی تربیت کرنے کے لئے ایک مثالی نمونہ قائم کریں، اس لئے مدارس کی چار دیواری میں دینی احکام پر عمل کرنے کا خوب اہتمام کرنا ضروری ہے، اس میں واضح کوتاہی کرنا متعدی گناہ کا باعث معلوم ہوتا ہے، خاص کر ہمارے معاشرہ میں جہاں خلافت نہ ہونے کی وجہ سے یہی دینی مدارس ہی دین کی کسی قدر ترجمانی کا منصب ادا کرتے ہیں، لہذا دینی مدارس میں اجارہ وغیرہ تمام معاملات کو شرعی احکام کے مطابق انجام دینا بہت ہی ضروری ہے، ان معاملات میں اختلافات ونزاعات کی بنیاد ہی یہی کوتاہی ہے کہ تقرری کے وقت تمام ضروری باتیں طے نہیں ہوتے حالانکہ یہ شرعی ہدایات کے تقاضا کے خلاف ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔(۲)

---

(۱) دینی مدارس اہمیت، موجودہ دشواریاں اور حل، عصرِ حاضر، جولائی ۹/ ۲۰۲۰ء

(۲) علمی وفقہی مقالات: ۴/ ۴۷

فہرست ماخذ ومراجع

قرآن وتفسیر قرآن

القرآن الکریم		
الاتقان فی علوم القرآن	جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر السیوطی ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء	الهیئة المصریة العامة للکتاب؛ سعودی عرب (۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء)
أضواء البیان فی إیضاح القرآن بالقرآن	محمد الأمین الجکنی الشنقیطی ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۳ء	دارعالم الفوائد،مکة مکرمہ
الجامع لأحکام القرآن (تفسیر القرطبی)	ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکرالقرطبی ۶۷۱ھ/ ۱۲۷۳ء	دارالکتب العلمیة ،بیروت
جامع البیان عن تأویل آی القرآن (تفسیر طبری)	ابوجعفر محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ/ ۹۲۳ء	دار إحیاء التراث العربی، بیروت
روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم	شہاب الدین محمود بن عبداللہ الآلوسی ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء	دار إحیاء التراث العربی
معارف القرآن	مفتی محمد شفیع بن یاسین عثمانی ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء	ادارہ المعارف، کراچی
ضیاء القرآن	پیر محمد کرم شاہ الازہری ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء	ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور

حدیث وشروح حدیث

الجامع الصحیح البخاری	امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری (۲۵۶/۱۹۴ھ)	دارطوق النجاۃ، بیروت/مکتبہ دارالسلام
الجامع الصحیح مسلم	امام مسلم بن حجاج النیشاپوری (۲۶۱/۲۰۶ھ)	دارالجیل، بیروت/مکتبہ دار السلام
الجامع (سنن الترمذی)	امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ/دار الغرب ال اِسلامی/	دار السلام الترمذی (۲۷۹/۲۰۹ھ)
سنن ابی داؤد	امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی (۲۷۵-۲۰۲ھ)	دارالکتب العلمیۃ
سنن النسائی	امام احمد بن شعیب النسائی (۳۰۳/۲۱۵ھ)	دارالرسالہ العالمیہ
مسند ال اِمام اَحمد بن حنبل	امام ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی (۲۴۱/۱۶۴ھ)	مؤسسۃ الرسالۃ / دار ابن الجوزی
مسند البزّار	امام احمد بن عمرو بن عبد الخالق البزار (م ۳۹۲ھ)	مکتبہ العلوم والحکم
مسند علی	بن الجعد علی بن الجعد البغدادی (م ۲۳۰ھ)	دارالکتب العلمیۃ، بیروت
الجامع الصغیر من حدیث البشیر النذیر	امام جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر السیوطی (۹۱۱/۸۴۹ھ)	دارالفکر، بیروت

کنز العمال فی سنن الاقوال والأفعال	علاء الدین علی بن حسام الدین المتقی الہندی (۸۸۵-۹۷۵ھ)	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت
جامع الأحادیث	امام سیوطی (۸۴۹-۹۱۱ھ)	دار الکتب العلمیۃ
المصنف فی الاحادیث والآثار	عبد الرزاق بن ہمام الصنعانی (۱۲۶-۲۱۱ھ)	مکتبۃ الرشد، ریاض
المصنف لابن ابی شیبۃ	امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ (۱۵۹-۲۳۵ھ)	مکتبۃ الرشد، ریاض
تیسیر شرح الجامع الصغیر	عبد الرؤوف المناوی (۹۵۲-۱۰۳۱ھ)	دار الکتب العلمیۃ
عارضۃ الأحوذی شرح جامع الترمذی	قاضی ابو بکر ابن العربی المالکی (۴۶۸-۵۴۳ھ)	دار الکتب العلمیۃ
فتح الباری شرح صحیح البخاری	حافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی (۷۷۳-۸۵۲ھ)	دار المعرفۃ/ دار ابن کثیر
عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری	بدر الدین محمود بن احمد العینی (۷۶۲-۸۵۵ھ)	دار احیاء التراث العربی
شرح صحیح البخاری	ابو الحسن علی بن خلف بن بطال المالکی (۳۸۸-۴۴۹ھ)	مکتبۃ الرشد، ریاض
المنہاج شرح صحیح مسلم	امام نووی، یحییٰ بن شرف النووی (۶۳۱-۶۷۶ھ)	دار الفکر، بیروت
السنن الکبریٰ للبیہقی	احمد بن الحسین البیہقی (۳۸۴-۴۵۸ھ)	دار الکتب العلمیۃ

تنقیح التحقیق فی أحادیث التعلیق	حافظ شمس الدین محمد الذہبی (۶۷۳-۷۴۸ھ)	دارالوطن، ریاض
سبل السلام شرح بلوغ المرام	حمد بن اسماعیل الأمیر الصنعانی (۱۰۹۹-۱۱۸۲ھ)	م دارالحدیث، مصر
حاشیہ السندی	علی ابن ماجہ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی السندی	(م ۱۱۳۸ھ) دار الجیل، بیروت
معالم السنن خطابی	حمد بن محمد بن ابراہیم (۳۱۹-۳۸۸ھ)	دارالمعرفۃ
شرح السنۃ	ابومحمد حسین بن مسعود البغوی (۴۳۳-۵۱۰ھ)	دارالکتب العلمیۃ
معرفۃ السنن والآثار	امام البیہقی (۳۸۴-۴۵۸ھ)	دارالکتب العلمیۃ
نخب الافکار شرح معانی الآثار	علامہ محمود بن احمد العینی (۷۶۲-۸۵۵ھ)	وزارۃ الأوقاف، قطر
التمہید لما فی الموطأ من المعانی والأسانید	امام ابوعمر یوسف بن عبدالبر (۳۶۸-۴۶۳ھ)	وزارۃ الأوقاف، المغرب
بذل المجہود شرح سنن ابی داوود	شیخ خلیل احمد سہارنپوری (۱۲۶۹-۱۳۴۶ھ)	دارالاشاعت، کراچی
شرح الطیبی علی مشکاۃ المصابیح	شرف الدین حسین بن عبداللہ الطیبی (م ۷۴۳ھ)	دارالکتب العلمیۃ
مراعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح	عبید اللہ بن محمد مبارکپوری (۱۲۹۳-۱۳۸۴ھ)	الجامعۃ السلفیہ، بنارس

فقہ و اصول فقہ

المبسوط	امام محمد بن حسن الشیبانی ۱۸۹ھ	دار المعرفۃ، بیروت
الدر المختار شرح تنویر الأبصار	علامہ محمد بن علی حصکفی حنفی ۱۰۸۸ھ	دار الکتب العلمیۃ، بیروت
نصب الرایہ لأحادیث الہدایۃ	امام جمال الدین الزیلعی حنفی ۷۶۲ھ	المکتب ال إسلامی، بیروت
فتاوی قاضی خان (الفتاوی الخانیہ)	فخر الدین حسن بن منصور قاضی خان ۵۹۲ھ	دار الکتب العلمیۃ، بیروت
المیزان الکبری	امام عبد الوہاب الشعرانی ۹۷۳ھ	دار الکتب العلمیۃ، بیروت
فتاوی بزازیہ	نظام الدین بزازی حنفی ۸۲۷ھ	دار الکتب العربی
الہدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی	برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی ۵۹۳ھ	دار إحیاء التراث العربی، بیروت
البنایۃ شرح الہدایۃ	بدر الدین محمود بن أحمد العینی ۸۵۵ھ	دار الکتب العلمیۃ، بیروت
الموسوعۃ الفقہیۃ		وزارۃ الأوقاف، کویت
العنایۃ شرح الہدایۃ	أکمل الدین محمد بن محمود بابرتی ۷۸۶ھ	دار الفکر، بیروت
فتاوی تاتارخانیہ	الامام فرید الدین عالم بن العلاء الدہلوی الھندی ۷۸٦ھ	دار الکتب العلمیۃ، بیروت

فتاوی ابن باز	شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ۱۴۲۰ھ	الرئاسۃ العامۃ للبحوث، ریاض
الدر المنتقی فی شرح الملتقی	علاء الدین محمد بن علی حصکفی ۱۰۸۸ھ	دار إحیاء التراث العربی، بیروت
المغنی	علامہ عبد اللہ بن أحمد بن قدامۃ المقدسی ۶۲۰ھ	مکتبۃ القاہرۃ، مصر
مقدمۃ رسم المفتی	علامہ محمد أمین بن عمر ابن عابدین شامی ۱۲۵۲ھ	دار ابن عابدین، دمشق
امداد الفتاوی	حکیم الامت اشرف علی تھانوی ۱۳۶۲ھ	مکتبہ دار العلوم، کراچی
مجموع الفتاوی	شیخ الاسلام احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ ۷۲۸ھ	دار عالم الفوائد، مکہ مکرمہ
فتاوی اللجنۃ الدائمۃ	علماء اللجنۃ الدائمۃ، سعودی عرب (موجودہ دور)	دار المؤید، الریاض
فتاوی علمائے اہل حدیث	متعدد علماء، برصغیر (موجودہ دور)	مکتبہ سلفیہ، لاہور
بہار شریعت	مفتی محمد امجد علی اعظمی ۱۳۶۷ھ	مکتبہ المدینہ، کراچی

اصلاحی و متفرق کتب

درر الاحکام شرح مجلۃ الاحکام،	الرئیس الاول لمحکمۃ التمیز علی حیدر،	دار عالم الکتب بیروت

مختصر خلافیات للمیادین ابن العباس الشافعی	للامام البیہقی رحمہ اللہ	مکتبۃ الرشد الریاض
فتوح البلدان	احمد بن یحیی بن جابر البلاذری ۲۷۹ھ	دار الفکر، بیروت
خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت	مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری	مکتبہ حسن
الفاروق	شبلی نعمانی ۱۳۳۲ھ	ندوۃ المصنفین، دہلی
ماہنامہ دارالعلوم دیوبند (مقالات)	متعدد علماء دارالعلوم دیوبند	دارالعلوم دیوبند
دین کے کاموں کی اجرت لینا کیسا ہے؟		دارالافتاء، جامعہ دارالعلوم کراچی
آن لائن دارالافتاء (فتاویٰ بنوری ٹاؤن)	مفتی محمد تقی عثمانی و دیگر	دارالافتاء، جامعہ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن
دارالافتاء اہلِ سنت	مفتی محمد سجاد عطاری مدنی	مکتبۃ المدینہ، کراچی
البلاغ (رسالہ)	دارہ البلاغ، لاہور	۱۰البلاغ پبلیکیشنز، لاہور
مسنون اصولِ تجارت	مفتی ابو بکر جابر صاحب قاسمی، مفتی رفیع الدین حنیف صاحب قاسمی	
دجالی فتنے کی نمایاں خدوخال	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی ۱۳۷۰ھ	دارالقلم، کراچی
اشرف السوانح	خواجہ عزیز الحسن مجذوب،	مکتبہ اشرفیہ، کراچی

تذکرۃ السامع والمتکلم فی آداب العالم والمتعلم	امام بدرالدین محمد بن جماعہ الشافعی ۷۳۳ھ	دار ابن حزم، بیروت
التحریر والتنویر	امام محمد الطاہر بن عاشور ۱۳۹۳ھ	دار سحنون، تونس
الشریعہ للآجری	للشیخ محمد بن حسین الآجری	مکتبۃ السنۃ، القاہرۃ
طبقات ابن سعد	محمد بن سعد بن منیع البغدادی ۲۳۰ھ	دار الکتب، بیروت
شرح النقایہ	علامہ عبید اللہ بن مسعود بن محمود الحنفی (صدر الشریعہ اول)۷۴۵ھ	دار الکتب العربی، قاہرہ
فقہی مقالات	مفتی محمد تقی عثمانی	مکتبہ دار العلوم کراچی

یادداشت

مرتب کی کتابیں

۱۔رمضان المبارک معروفات ومنکرات
۲۔اصلاحی واقعات دو جلدیں
۳۔اصلاح الرسوم (تسہیل، تعلیق وتخریج)
۴۔عصری خطبات مجلد (زیرِطبع)
۵۔جماعت اولیٰ کی اہمیت وجماعت ثانیہ کی حیثیت
۶۔نیا سال مغرب اور اسلام کا نقطۂ نظر
۷۔کرسمس کی حقیقت عقل ونقل کی روشنی میں
۸۔ویلنٹائن ڈے تاریخ کے آئینہ میں
۹۔اپریل فول کی تاریخی حیثیت
۱۰۔خیر البیان (مدارس کے طلبہ کے لئے)
۱۱۔ہندوستانی مسلمان آزادیٔ وطن سے تعمیرِ وطن تک (زیرِطبع)
۱۲۔نفع المفتی والسائل (عربی، تحقیق وتخریج، زیرِطبع)
۱۳۔ اللمعة اذا اجتمع العيد والجمعة
۱۴۔کھیل کود کی تاریخی وشرعی حیثیت
۱۵۔احکام اعتکاف
۱۶۔خواتین رمضان کیسے گذاریں؟
۱۷۔یوم جمہوریہ حقیقت کے آئینہ میں
۱۸۔پتنگ بازی حقائق ونقصانات
۱۹۔وجودِ باری وتوحیدِ باری عقل کی روشنی میں
۲۰۔ضیافت فضائل ومسائل

۲۱۔عظمتِ اہلِ بیت اور مسئلہ زکوۃ
۲۲۔ارطغرل غازی سیریل حقائق اور غلط فہمیاں
۲۳۔یتیمی اور یتیموں کے کارنامے
۲۴۔لون (قرض) کے جدید مسائل (زیرِ طبع)
۲۵۔ظالموں کا انجام سچے واقعات کی روشنی میں
۲۶۔کرکٹ کی تاریخی و شرعی حیثیت
۲۷۔فروع الایمان (تسہیل، تخریج و تضمیم)
۲۸۔قربانی ِمنکرات و مسالک کے اختلافات کا حل
۲۹۔عصمت دری اسباب و سد باب
۳۰۔سنتِ فجر فضائل و مسائل
۳۱۔خطباتِ قاسمیہ
۳۲۔برادرانِ وطن سے تعلقات۔حدود و حقوق
۳۳۔کمیشن اور بروکری کے احکام
۳۴۔کرایہ کے جدید مسائل
۳۵۔ٹوپی کی شرعی حیثیت
۳۶۔اسلام میں تجارت کی اہمیت
۳۷۔جبر تبدیلیٔ مذہب کی حقیقت
۳۸۔اسلام میں تقسیمِ میراث کی اہمیت اور ہمارا سماج
۳۹۔مروّجہ مضاربت کے احکام
۴۰۔اولاد کے حقوق شریعت و سماج کی روشنی میں
۴۴۔لو جہاد حقیقت یا فسانہ

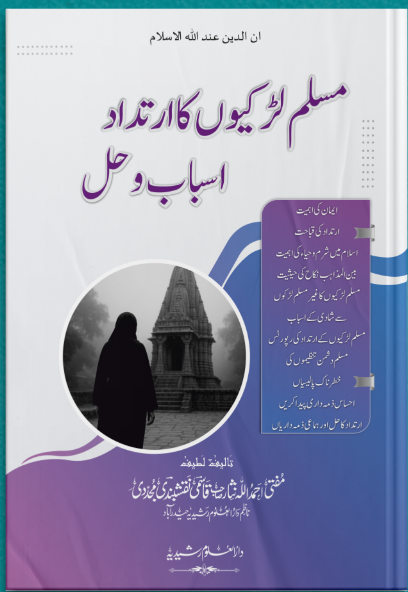
۴۵۔صحبتِ اہل اللہ کی اہمیت وضرورت
۴۶۔تیسیر المبتدی بترتیبِ جدید فارسی (حصہ اوّل، دوم، سوم)
۴۷۔نفقۂ مطلّقہ عقل ونقل کی روشنی میں
۴۸۔تعلیم بالغان و بزرگان۔اہمیت وضرورت
۴۹۔خواتین کے علمی کارنامے۔حافظہ وعالمہ بنانے کی ضرورت
۵۰۔مکاتب کی اہمیت وضرورت
۵۱۔منظم ومؤثر مکاتب کے اصول وآداب
۵۲۔مسنون امامت۔اصول وآداب
۵۳۔مسنون مساجد۔خادمانِ مساجد کی ذمہ داریاں
۵۴۔قتل کا گناہ اور سماج کی صورتِ حال
۵۵۔زمینات ومکانات؛احکام ومسائل
۵۶۔ملٹی لیول مارکیٹنگ۔اقسام واحکام
۵۷۔ذکرِ حبیب ﷺ کی برکات
۵۸۔ووٹر آئی ڈی۔ووٹنگ۔الیکشن
۵۹۔اسلاموفوبیا وفلمی دنیا اور فلم ہمارے ۱۲، کا پوسٹ مارٹم
۶۰۔بھارتی مذاہب کی تاریخِ زوال
۶۱۔ذاتی مکان یا کرایہ کا مکان احکام وآداب
۶۲۔تعلیمِ نسواں ومکاتبِ بالغات کی اہمیت
۶۳۔سادات واہلِ بیت کی عظمت ومسئلہ زکوۃ
۶۴۔عظمتِ حفظِ قرآن ومقامِ حفّاظ
۶۵۔قربانی وگاؤکشی۔حقائق اور غلط فہمیاں

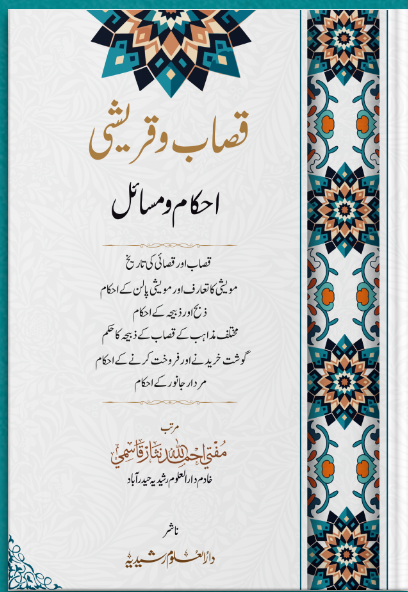
٦٦۔قصاب اور قریشی۔احکام ومسائل
٦٧۔میلاد النبی کی حقیقت دلائل کی روشنی میں
٦٨۔مسنون قربانی؛معروفات ومنکرات
٦٩۔سونے کی تجارت کے جدید احکام
٧٠۔سرکاری اسکیموں کے احکام
٧١۔دینی امور پر اجرت کا حکم اور غلط فہمیوں کا ازالہ
٧٢۔عظماء فی طفولتھم۔بڑوں کے بچپن کے تاریخی وسبق آموز واقعات۔
٧٣۔اسکول وکالج میں دینیات کا نصاب،نظام وطریقۂ کار

مصنف کی دیگر کتابیں









DARUL ULOOM RASHEEDIA

Door Number 12-2-823/A/28A1 Masjid E Qutub Shahi
2nd Floor, opp MS college Santosh Nagar Colony,
(Pillar No17) Mehdipatnum Hyderabad-500028 (T.S)
WWW.darululoomrasheediya.com